بیاد
ابنِ امیرِ شریعت سیّدِ عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ
نقیبِ ختمِ نبوّت ملتان

۱۱ شوال ۱۴۲۷ھ ------- نومبر ۲۰۰۶ء

اتحادی افواج کی عراق و افغانستان سے مسلسل پسپائی

صاحبزادہ طارق محمود رحمۃ اللہ علیہ
اک شجر سایہ دار تھا نہ رہا

حکومت کی بدترین قادیانیت نوازی

گوانتاناموبے میں کیا قیامت ڈھائی جارہی ہے؟
پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر مُلّا عبدالسلام ضعیف کی امریکی عقوبت خانے میں گزرے لہو رنگ دل گداز روداد

IN THE LINE OF FIRE
''یادوں کی برات''

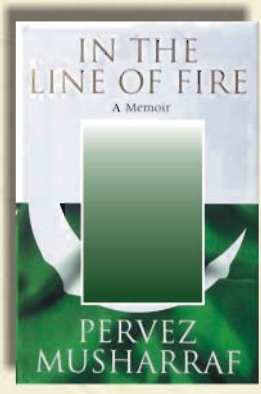

سیاسی بداعمالیوں کی دستاویز

نورِ ہدایت

القرآن

’’کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا ٹھہرا وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند اور ستاروں کو پیدا کیا سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں، دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے، یہ خدائے رب العالمین بڑی برکت والا ہے ۝ (لوگو) اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو وہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔‘‘ (الاعراف۔۵۴،۵۵)

الحدیث

’’حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ’’جس نے عیدالفطر کے بعد چھے روزے رکھ لیے تو ان سے اس کے سال کا حساب پورا ہوگیا‘‘ (کیونکہ قاعدہ ہے) مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا. یعنی جو شخص نیک کام کرے گا اس کا دس گناہ ملے گا۔‘‘

(رواہ ابن ماجہ)

الآثار

’’جو لوگ صحرائے زیست کو گلشن رعنا بنانے کے لیے اپنی عمر گنوا دیتے ہیں اور سب مال و منال اور توانائیاں لٹا دیتے ہیں مگر لیلائے اقتدار کے ساتھ شب باشی ان کے نصیب میں نہیں ہوتی اور شہرِ سیاست کی کڑی دھوپ میں انہیں زلفِ اقتدار کی گھنی چھاؤں تک میسر نہیں آتی تو حسرت و یاس کی یہ جامد تصویریں اور ان کی اذیت ناک پستی عبرت کا مرقع بن کے رہ جاتی ہے۔ پھر یہ وحشی سیاست انتقال کی تاریکیوں کے سانچے میں ڈھل کر سیاسی تجبہ گری کو پیشہ بنا لیتا ہے اور اقتدار کی دیوی چھیننے والوں کو کوستا ہے۔ تمام پرویزی حیلوں اور اشتری چالوں سے خواص اور مقتدرین کو بلیک میل کرتا ہے اور یوں آئندہ الیکشن تک اپنے زخم چاٹتا رہتا ہے۔‘‘

(’’دل کی بات‘‘۔ ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاریؒ۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۹۴ء)

ماہنامہ

نقیبِ ختمِ نبوت ملتان

جلد 17 شمارہ 11 | شوال 1427ھ — نومبر 2006ء

Regd.M.NO.32, I.S.S.N.1811-5411

بیاد

سید الاحرار حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

بانی

ابنِ امیرِ شریعت سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ

ابن امیر شریعت حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ

مدیر مسئول

سید محمد کفیل بخاری

معاون مدیر

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

رفقائے فکر

پروفیسر خالد شبیر احمد

عبداللطیف خالد چیمہ، سید یونس الحسنی

مولانا محمد مغیرہ، محمد عمر فاروق

آرٹ ایڈیٹر

محمد الیاس میراں پوری

i4ilyas1@hotmail.com

سرکولیشن منیجر

محمد یوسف شاد

تشکیل

دل کی بات	اتحادی افواج کی عراق و افغانستان سے مسلسل پسپائی	عبداللطیف خالد چیمہ	2
دین و دانش:	سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تاریخ کے آئینے میں	محمد عثمان حیدر	4
//	سیدنا ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ	ابوسفیان تائب	7
بازگشت:	خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا	سید عطاء المحسن بخاریؒ	11
افکار:	''یادوں کی برات''	سید محمد معاویہ بخاری	13
//	سویرا طلوع ہو رہا ہے	محمد احمد حافظ	16
//	سیاسی بداعمالیوں کی دستاویز	یاسر محمد خان	19
//	سوچئے مگر ''حدود'' کے اندر	پروفیسر ڈاکٹر محمد امین	23
//	پاکستان میں مغربی ثقافت وملحدانہ افکار کا نفوذ اور اس کے اسباب	نثار احمد خان فتحی	26
شاعری:	اللہ اللہ کرو دوستو!	ڈاکٹر امتیاز احمد عباسی	28
//	نعت رسول مقبول ﷺ	پروفیسر خالد شبیر احمد	30
//	عہد حاضر کی لڑکیوں سے کہو	حکیم احمد شجاع ساحر	31
//	بے پردا	شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی	32
گوشۂ محسن احرار:	سید عطاء المحسن بخاریؒ سے میرے تعلقات (پہلی قسط)	حکیم محمود احمد ظفر	33
//	بت کدے میں اذان	خالد ہمایوں	42
اقبالیات:	علامہ اقبالؒ	شورش کاشمیریؒ	45
یادِ رفتگاں:	صاحبزادہ طارق محمود رحمۃ اللہ علیہ	محمد اورنگ زیب اعوان	47
سرگزشت:	پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کی خودنوشت (دوسری قسط)	ترجمہ و تلخیص: فدا محمد عدیل	50
انتخاب:	داڑھی......!	نوائے وقت	60
اخبار الاحرار:	مجلس احرار اسلام کی تنظیمی سرگرمیاں	ادارہ	61

زرِ تعاون سالانہ

اندرونِ ملک	150 روپے
بیرونِ ملک	1000 روپے
فی شمارہ	15 روپے

ترسیل زر بنام: نقیبِ ختمِ نبوت

اکاؤنٹ نمبر 1-5278

یو بی ایل چوک مہربان ملتان

ای میل ایڈریس: majlisahrar@hotmail.com
majlisahrar@yahoo.com

تحریک تحفظ ختم نبوۃ شعبۂ تبلیغ مجلس احرار اسلام پاکستان

مقام اشاعت: دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان ناشر: سید محمد کفیل بخاری طابع: تشکیل نو پرنٹرز

Dar-e-Bani Hashim, Mehrban Colony, Multan.(Pakistan)

رابطہ: دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان

☎061-4511961

دل کی بات

عبداللطیف خالد چیمہ

اتحادی افواج کی عراق وافغانستان سے مسلسل پسپائی

نائن الیون کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے سراسر یک طرفہ طور پر اسلام اور اہل اسلام کے خلاف جس سفاکی کا مظاہرہ کیا' پوری دنیا اس کے منطقی انجام کی شدت سے منتظر ہے۔ تمام وسائل پر مکمل کنٹرول کے باوجود ایسی خبریں مل جاتی تھیں جو حقیقت حال کا پتا دیتی تھیں۔ لیکن گزشتہ چند ہفتوں میں ایسی خبروں میں خاصی تیزی آئی ہے جو صورتحال کی واضح تبدیلی کا پتا بھی دے رہی ہیں خود امریکہ اور برطانیہ میں اس پر اتنا کچھ لکھا اور کیا جا رہا ہے کہ اندر کی آنکھ سے دیکھا جائے تو سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے۔ برطانوی فوج کے نئے سربراہ جنرل رچرڈ ڈینٹ نے چند روز پیشتر ایک برطانوی اخبار سے انٹرویو میں کہا ہے کہ عراق میں برطانوی افواج کی موجودگی سے صورتحال مزید بدتر ہو رہی ہے۔ لہٰذا برطانوی فوج کو عراق سے جلد سے جلد واپس بلا لینا چاہیے۔ جنرل رچرڈ ڈینٹ نے انٹرویو میں وزیراعظم ٹونی بلیئر کی پالیسیوں کو ناسمجھی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اب ہم اُن کے لیے ناقابل برداشت ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عراق میں برطانوی افواج کی مسلسل موجودگی ملک میں سلامتی کی صورتحال خراب کر رہی ہے۔ اس لیے ان کا جلد از جلد انخلاء ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری فوجی کارروائی حقیقتاً ٹانگ مار کر دروازہ کھولنے والی بات تھی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ برطانوی آرمی چیف کی اس حق گوئی کے بعد کوئی بات چھپی ہوئی باقی نہیں رہی۔ ویسے بھی امریکی صدر بش کے پوری دنیا کو ''زیر'' اور اپنی ''رعایا'' میں تبدیل کرنے کے موہوم خواب کو پورا نہ ہوتے دیکھ کر عراق وافغانستان میں بڑھتی ہوئی تحریک مزاحمت کے پیش نظر اتحادی مزید ذلت ورسوائی سے دوچار ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ اتحادی اپنے انسان دشمن رویوں کا ٹھنڈے دل سے بغور جائزہ لے کر مظلوم ومحکوم اقوام کے غصب شدہ حقوق واپس کر دیں۔ ہم اپنے ملک کے فوجی حکمران سے بھی کہتے ہیں کہ وہ نوشتہ دیوار پڑھ لیں اور اختیار واقتدار کے نشے سے نکل آئیں۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی کردار کشی اور دشمن کی زبان بولنے سے اقتدار کی مزید طوالت شاید اب ممکن نہ رہے اور آئی ایس آئی کے بعض سابق ذمہ داران پر الزام تراشیوں کے سہارے اب کام چلتا نظر نہیں آتا۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ جنرل پرویز کا اقتدار رہے یا نہ رہے آئندہ برس اتحادیوں اور ان کے ہم نواؤں کو افغانستان اور عراق میں جس مزاحمت کا سامنا ہوگا' ان شاءاللہ دنیا نہ صرف دیکھے گی بلکہ محسوس کرے گی۔ افغانستان میں تو طالبان کی شدید مزاحمت نے چار کلیٹ سولجرز کو پگھلنے پر مجبور کر دیا ہے وہاں طالبان کے گڑھ صوبہ ہلمند کے ضلع موسیٰ قلعہ سے برطانوی فوج ایک معاہدے کے بعد مقامی عمائدین کو کنٹرول حوالے کر کے نکل گئی ہے۔ وزیرستان طرز کے معاہدے اب پورے افغانستان میں دیکھنے کو ملیں گے۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ طاقت کے ذریعے مخالفین کو مٹانے کی پالیسی ایک احمقانہ فیصلہ ہے۔

حکومت کی بدترین قادیانیت نوازی:

وزارت داخلہ پاکستان کی طرف سے ''نادرا'' کے ذریعے بیرون ممالک پاکستانیوں کے لیے بننے والے شناختی کارڈز (پاکستان اوریجن کارڈ POC اور شناختی کارڈ برائے اوورسیز پاکستانیز NICOP) کے لیے جاری ہونے والے کارڈوں سے ختم نبوت والا حلف نامہ خارج کر دیا ہے جبکہ اندرون ملک بننے والے شناختی کارڈز کے لیے جاری ہونے والے فارموں میں یہ حلف نامہ موجود ہے۔ شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور ضروری دستاویزات میں یہ حلف نامہ ۱۹۷۴ء میں مرزائیوں کے حوالے سے قانون سازی اور ۱۹۸۴ء میں امتناعِ قادیانیت ایکٹ جیسے قوانین کی روشنی میں شامل کیا گیا تھا جو نہ صرف آئین کا تقاضا تھا بلکہ یہاں کے معروضی حالات اور امت مسلمہ کے عقائد و جذبات کا آئینہ دار بھی ہے۔

حلف نامے والی عبارت کے بغیر طبع شدہ فارم جو بیرون ممالک سفارت خانوں کے ذریعے پاکستانی حاصل کرتے ہیں' اُن کی کاپیاں خود ہمارے ریکارڈ میں موجود ہیں اور ملک کے اخبارات کا وزارتِ خارجہ سے اس بات پر رابطہ بھی ہو چکا ہے۔ وزارتِ خارجہ کے ذمہ داران اس صورتحال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے پائے۔ تحفظ ختم نبوت کے محاذ پر کام کرنے والی تمام جماعتیں، ادارے اور شخصیات اس پر ابتدائی سطح کا احتجاج بھی کر چکی ہیں۔ اگر اس کا فوری تدارک نہ کیا گیا تو اسلامیانِ پاکستان اور بیرون ممالک رہنے والے پاکستانی مسلمانوں میں تشویش بڑھے گی۔

ہم ان سطور کے ذریعے وزارتِ خارجہ اور متعلقہ اعلیٰ حکام کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس قانونی تقاضے کو بلا تاخیر پورا کریں اور اس کے ذمہ داران کے خلاف سخت کارروائی عمل میں لائی جائے۔

ختم نبوت کے حوالے سے بعض کتب پر ناروا پابندی:

اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت نے بعض کتب پر پابندی کا اعلان کرتے ہوئے عقیدۂ ختم نبوت کی تشریح اور ردّ قادیانیت پر مبنی بعض کتب کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ عقیدہ ختم نبوت کی وضاحت و تشریح پر مبنی لٹریچر دراصل قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے۔ امت کے چودہ سو سالہ متفقہ اور اجماعی عقیدے کی روشنی میں قادیانیوں سمیت انکارِ ختم نبوت پر مبنی تمام فتنے دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ اب اگر حکومت عقیدۂ ختم نبوت پر مبنی اور فتنہ ارتداد مرزائیہ کے حوالے سے طبع شدہ بعض کتب پر پابندی کا اعلان کرتی ہے تو اس کا بہت واضح مطلب یہ ہے کہ موجودہ حکومت خود اشتعال انگیز اقدامات کر کے صورتحال کو مزید خراب کرنا چاہتی ہے۔ مجلس احرار اسلام اس مسئلہ پر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مؤقف کی مؤید ومعاون ہے اور ان سطور کے ذریعے اعلان کرتی ہے کہ اس قسم کی کسی پابندی کو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کا کوئی آئینی وقانونی جواز ہے۔

☆☆☆

محمد عثمان حیدر

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تاریخ کی مظلوم شخصیت

امیر المؤمنین خلیفۂ راشد جلیل القدر صحابی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عالم اسلام کی ان چند گنی چنی ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے احسانات سے یہ امت مسلمہ سبکدوش نہیں ہوگی۔ آپ ان چند کبار صحابہ میں سے ہیں جن کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسلسل حاضری اور حق تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ وحی کو لکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

پھر آپ اسلامی دنیا کی وہ مظلوم ہستی ہیں جن کی خوبیوں اور ذاتی محاسن اور کمالات کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ ان کو چھپانے کی پیہم کوششیں کی گئیں۔ آپ پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے آپ کے متعلق ایسی باتیں گھڑی گئیں اور ان کو پھیلایا گیا، جن کا کسی عام صحابی سے تو درکنار کسی ایک شریف انسان میں پایا جانا مشکل ہے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جس شدومد کے ساتھ پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کیا گیا اس کی وجہ سے آپ کا وہ حسین کردار نظروں سے اوجھل ہوگیا ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض وصحبت نے پیدا کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بس جنگ صفین کے قائد کی حیثیت سے جانتی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے آئے تھے، لیکن وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منظور نظر تھے جنہوں نے کئی سال تک آپ کے لیے کتابتِ وحی کے نازک فرائض سرانجام دیئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے علم وعمل کے لیے بہترین دعائیں لیں۔ جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے خلیفہ کے زمانہ میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا، جنہوں نے تاریخِ اسلام میں سب سے پہلا بحری بیڑہ تیار کیا اپنی بہترین عمر کا حصہ رومی عیسائیوں کے خلاف جہاد میں گزارا اور ہر بار ان کے دانت کھٹے کیے۔ ۶۵ لاکھ مربع میل پر اسلامی حکومت کی۔ ۲۰ سال گورنر رہے اور ۱۹ سال خلافت قائم رہی۔ آج دنیا ان کو فراموش کر چکی ہے۔ لوگ یہ جانتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ وہ ہیں جن کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ ہوئی تھی لیکن قبرص، روڈس، صقلیہ اور سوڈان جیسے اہم ممالک کس نے فتح کیے؟ سالہا سال کے باہمی خلفشار کے بعد عالمِ اسلام کو پھر ایک جھنڈے تلے کس نے متحد کیا؟ جہاد کا جو فریضہ تقریباً متروک ہو چکا تھا۔ اسے ازسرنو کس نے زندہ کیا؟ اور اپنے عہدِ حکومت میں نئے حالات کے مطابق شجاعت اور جواں مردی، علم وعمل، علم وبردباری، امانت ودیانت میں نظم وضبط کی بہترین مثالیں کس نے قائم کیں؟

یہ ساری باتیں وہ ہیں جو پروپیگنڈے کی غلیظ تہوں میں چھپ کر رہ گئی ہیں۔ اس مضمون میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی کے انہیں حسین پہلوؤں کو سامنے لانا مقصود ہے۔ یہ آپ کی مکمل سیرت نہیں بلکہ آپ کی سیرت کے وہ گوشے ہیں جو تاریخ کے ملبہ میں دب کر آج نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو رہے ہیں۔ اور ان کے مطالعہ سے حضرت

امیر معاویہ ؓ کے کردار کی ایک ایسی تصویر سامنے آتی ہے جو ہر لحاظ سے دلکش ہی دلکش ہے۔ امید ہے قارئین اس تصویر میں تاریخ اسلام میں اس عظیم کردار کی ایک دلآویز جھلک دیکھ سکیں گے۔

حضرت معاویہ ؓ آنحضرت ﷺ کی نظر میں:

حضرت معاویہ ؓ نبی کریم ﷺ کے معتمد ترین اصحاب میں شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے آپ کو کتابت وحی کے لیے مامور فرمایا تھا۔ چنانچہ جو وحی آپ ﷺ پر نازل ہوتی اسے قلم بند فرماتے۔ جو خطوط وفرامین سرکار دو جہان ﷺ کی طرف سے جاری ہوتے انہیں بھی تحریر فرماتے۔ نبی کریم ﷺ کے کاتبین میں سب سے زیادہ حضرت زید بن ثابت ؓ آپ کی خدمت میں حاضر رہے اور ان کے بعد دوسرا درجہ حضرت معاویہ ؓ کا تھا۔ یہ دونوں حضرات دن رات آپ کی خدمت میں لگے رہتے اس کے سوا کوئی اور کام نہ کرتے تھے۔

حضرت معاویہ ؓ کے لیے نبی کریم ﷺ نے کئی بار دعا فرمائی حدیث کی مشہور کتاب جامع الترمذی میں ہے ایک بار نبی کریم ﷺ نے آپ کو یہ دعا دی اور فرمایا:

" اللهم اجعله هاديا و مهديا و اهدبه"

''اے اللہ معاویہ کو ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنا دیجئے اور اس کے ذریعے سے لوگوں کو ہدایت دیجئے۔''

(جامع ترمذی ص ۲۴۷، جلد دوم)

اور ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آپ کو دعا دی اور فرمایا:

اللهم علم معاوية الكتاب و الحساب وقه العذاب

''اے اللہ معاویہ کو حساب کتاب سکھا اور اس کو عذاب جہنم سے بچا۔''

(ابن عبدالبر ''الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۳۸۱، ج ۳)

مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

اللهم علمه الكتاب ومكن له فى البلادو وقه العذاب.

''اے اللہ معاویہ (ؓ) کو کتاب سکھا دے اور شہروں میں اس کو حکومت عطا فرما اور اس کو عذاب سے بچا۔''

(مجمع الذوائد منبع الفوائد ص ۳۵۶ ج ۹)

حضرت امیر معاویہ ؓ خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نبی کریم ﷺ کے واسطے وضو کا پانی لے کر گیا آپ نے پانی سے وضو فرمایا اور وضو کرنے کے بعد میری طرف دیکھا اور فرمایا اے معاویہ اگر تمہارے سپرد امارت کی جائے (اور تمہیں امیر بنا جائے) تو اللہ سے ڈرتے رہنا اور تم انصاف کرنا (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲۳) اور بعض روایات میں ہے کہ

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص اچھا کام کرے اس کی طرف توجہ کر اور مہربانی کر؟ اور جو کوئی برا کام کرے اس سے درگزر کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کے بعد خیال لگا رہا ہے کہ مجھے اس کام میں ضرور آزمایا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا مجھے امیر بنایا گیا۔ اس روایت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ نبوی ﷺ میں کیا مرتبہ حاصل تھا؟ اور آپ ﷺ ان سے کتنی محبت فرماتے تھے نیز ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سواری پر سوار ہوئے اور حضرت امیر معاویہ کو اپنے پیچھے بٹھایا تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اے معاویہ (رضی اللہ عنہ)! تمہارے جسم کا کونسا حصہ میرے جسم کے ساتھ مل رہا ہے۔ انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میرا پیٹ اور میرا سینہ آپ کے جسم مبارک کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے دعا دی: **اَللّٰھُمَّ املاہ علماً**: اے اللہ اس کو علم سے بھر دے۔ حافظ ذہبی تاریخ اسلام ص ۳۱۹ جلد دوم ''یہ تو ہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی نظر میں۔ صحابہ کے تو بے شمار اقوال ہیں جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: آپ نے فرمایا اے لوگو تم میرے بعد آپس میں فرقہ بندی سے بچنا اور اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ رکھو کہ معاویہ شام میں موجود ہے (الاصابہ، ابن حجر، ص ۴۱۴ ج ۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک فقہی مسئلے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی گئی۔ آپ نے فرمایا: **انہ قد صحب رسول اللّٰہ ﷺ** (کہ معاویہ نے حضور ﷺ کی صحبت کا شرف اٹھایا ہے) اس لیے ان پر اعتراض نہ کیا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تنقید برداشت نہ فرماتے تھے اور ان کے مقام سے بخوبی واقف تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی وفات ۲۲ رجب ۶۰ھ مطابق اپریل ۶۸۰ء ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ سیدنا ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ (الاستیعاب ج ۱ ص ۲۶۲)

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون .

ابوسفیان تائب

سیدنا ابوعبیدہ ابن جرّاح رضی اللہ عنہ
(امین الامۃ، فاتح شام)

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: '' **لِکُلِّ اُمّۃ امین، وامین ھٰذہ الامۃ ابوعبیدہ ابن جرّاح .** ''
''ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس امت کے امین حضرت ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہ) ابن جرّاح ہیں''۔ (بخاری ومسلم)

حضرت حسن بصریؒ مرسلاً روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص ایسا ہے کہ میں چاہوں تو اس کے اخلاق میں کسی نہ کسی بات کو میں قابل اعتراض قرار دے سکتا ہوں سوائے ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہ) کے۔ (مستدرک الحاکم، ج ۳، ص ۲۶۶)

سیدنا ابوعبیدہ ابن جرّاح رضی اللہ عنہ، حضور اقدس ﷺ کے ان جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن کی ذات گرامی اس دور کے تمام اعلیٰ فضائل ومناقب کا مجموعہ تھی۔ سابقین اوّلین میں سے ہیں اور اس وقت اسلام لے آئے تھے، جب مسلمانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ آپ ان دس خوش نصیب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن کو عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے اور جن کو خود سرکار دو عالم ﷺ نے جنتی ہونے کی بشارت دی تھی۔ آپ کا شمار ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی ہے جنہیں دو مرتبہ ہجرت کی سعادت حاصل ہوئی۔ پہلی بار آپ نے حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی اور دوسری بار مدینہ منورہ کی طرف۔ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ غزوات میں ہمیشہ نہ صرف شامل رہے، بلکہ ہر موقع پر اپنی جانبازی، عشقِ رسول اور اطاعت واتباع کے انمٹ نقش قائم فرمائے۔ غزوہ بدر کے موقع پر ان کے والد کفار مکہ کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آئے تھے اور جنگ کے دوران اپنے بیٹے (سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ) کو نہ صرف تلاش کرتے تھے بلکہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح ان سے آمنا سامنا ہو جائے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اگرچہ اپنے والد کے کفر سے بیزار تھے، لیکن یہ پسند نہ کرتے تھے کہ ان پر اپنے ہاتھ سے تلوار اٹھانی پڑے، اس لیے جب کبھی وہ سامنے آ کر مقابلہ کرنا چاہتے تو یہ کترا جاتے لیکن باپ نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور بالآخر انہیں مقابلہ کرنا ہی پڑا اور جب باپ اور بیٹا مقابل ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے جو رشتہ قائم تھا، اس کی راہ میں حائل ہونے والا ہر رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ باپ اور بیٹے کے درمیان تلوار چلی اور ایمان کفر پر غالب آ گیا۔ باپ بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ (الاصابہ للحافظ ابن حجر۔ ج دوم)

غزوہ اُحد میں جب کفار کے ناگہانی ہلّے میں سرکار دو عالم ﷺ کے مِغفر کے دو حلقے آپ ﷺ کے رخسار مبارک کے اندر گھس گئے تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے دانتوں سے پکڑ کر نکالا۔ یہاں تک کہ اس کش مکش میں حضرت

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کے دو دانت گر گئے۔ دانت گر جانے سے چہرے کی خوش نمائی میں فرق آ جانا چاہیے تھا' لیکن دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان کے دانتوں کے گرنے سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حُسن میں کمی آنے کے بجائے اور اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ کوئی شخص جس کے سامنے کے دانت گرے ہوئے ہوں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا گیا۔ (مستدرک الحاکم)

جب یمن کے لوگ مسلمان ہوئے اور انہوں نے اپنے درمیان کوئی معلم بھیجنے کی درخواست کی تو حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ ابن جرّاح رضی اللہ عنہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا''ھذاامین ھٰذہ الامۃ'' (یہ اس امت کے امین ہیں) اور آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد توصحیحین میں مروی ہے کہ: ''لِکُلِّ اُمّۃ امین، وامین ھٰذہ الامۃ ابوعبیدہ ابن جرّاح'' (''ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے، اور اس امت کے امین حضرت ابوعبیدہ ابن جرّاح ہیں''۔) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آنحضرت ﷺ کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ محبوب کون تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ''ابوبکر رضی اللہ عنہ''۔ پوچھا گیا کہ ان کے بعد کون؟ فرمایا ''عمر رضی اللہ عنہ''۔ پھر پوچھا گیا کہ ان کے بعد کون؟ اس کے جواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ''ابوعبیدہ ابن جرّاح رضی اللہ عنہ''۔ حضور نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد جب سقیفۂ بنی ساعدہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتماع ہوا اور خلافت کی بات چلی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے دو نام پیش فرمائے۔ ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اور دوسرے حضرت ابوعبیدہ ابن جرّاح رضی اللہ عنہ کا۔ لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں کسی اور پر اتفاق ہونے کا سوال ہی نہ تھا، مسلمان آپ ہی پر متفق ہوئے لیکن اس موقع پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا نام سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے پیش ہونا واضح کرتا ہے کہ جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہ میں آپ کا مقام کیا تھا؟

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں شام کی مہمات حضرت ابوعبیدہ ابن جرّاح رضی اللہ عنہ ہی کے سپرد فرمائی تھیں۔ چنانچہ اردن اور شام کا بیش تر علاقہ آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے فتح ہوا۔ غزوہ یرموک کے موقع پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق سے شام بھیجا تو اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام کی مہمات کا امیر بنا دیا تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت کے آغاز ہی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امارت سے معزول کر کے حضرت ابوعبیدہ ابن جرّاح رضی اللہ عنہ کو ہی امیر بنا دیا اور پھر سارا شام آپ کی سرکردگی میں فتح ہوا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ آپ کی ماتحتی میں شریکِ جہاد رہے اور آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے شام کے گورنر کے فرائض بھی انجام دیئے۔ شام کا خطہ اپنی زرخیزی، آب وہوا اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے عرب کے صحرانشینوں کے لیے ایک جنتِ ارضی سے کم نہ تھا۔ دوسری طرف یہاں اس وقت کے لحاظ سے انتہائی متمدّن تہذیب یعنی رومی تہذیب کا دور دورہ تھا، لیکن ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرکار دوعالم ﷺ کے فیض صحبت سے جو انمٹ رنگ اپنے قلب ودماغ پر چڑھا لیا تھا، اس میں وہ اس قدر پختہ تھے کہ شام کی رنگینیاں ان کے زہد وقناعت، دنیا بیزاری اور آخرت کی ہمہ وقتی فکر پر ذرّہ برابر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اس بات کا

اندازہ حضرت ابوعبیدہ ابن جرّاح رضی اللہ عنہ کے اس واقعے سے ہوگا۔

حضرت ابوعبیدہ ابن جرّاح رضی اللہ عنہ شام کے گورنر تھے تو اسی زمانے میں امیر المومنین سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر تشریف لائے، ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ: ''مجھے گھر لے چلئے''۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جواب دیا کہ: ''آپ میرے گھر میں کیا کریں گے؟ وہاں آپ کو شاید میری حالت پر آنکھیں نیچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو''۔ لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر لے گئے۔ جب گھر میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی سامان ہی نظر نہ آیا' گھر ہر قسم کے سامان سے خالی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حیران ہوکر پوچھا'' آپ کا سامان کہاں ہے؟ یہاں تو بس ایک نمدہ، ایک پیالہ، ایک مشکیزہ نظر آرہا ہے، آپ امیر شام ہیں، آپ کے پاس کھانے کی بھی کوئی چیز ہے؟'' یہ سن کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ایک طاق کی طرف بڑھے اور وہاں سے روٹی کے کچھ ٹکڑے اٹھالائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو رو پڑے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''امیر المؤمنین! میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ آپ میری حالت پر آنکھیں نیچوڑیں گے بات دراصل یہ ہے کہ انسان کے لیے اتنا اثاثہ کافی ہے جو اسے اپنی خواب گاہ (قبر) تک پہنچادے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ابوعبیدہ! دنیا نے ہم سب کو بدل دیا' مگر تمہیں نہیں بدل سکی''۔ اللہ اکبر! وہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جس کے نام سے قیصرِ روم کی عظیم طاقت وسلطنت لرزہ براندام تھی، جس کے ہاتھوں روم کے عظیم الشان قلعے فتح ہورہے تھے اور جس کے قدموں پر روزانہ رومی مال ودولت کے خزانے ڈھیر ہوتے تھے، وہ روٹی کے سوکھے ٹکڑوں پر زندگی بسر کررہا تھا..... دنیا کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر اسے اتنا ذلیل ورسوا کسی نے کیا تو وہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی جاں نثار تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے اتنے قدردان تھے کہ ایک مرتبہ جب اپنے بعد خلیفہ کے تقرر کا سوال آیا تو آپ نے فرمایا کہ ''اگر ابوعبیدہ کی زندگی میں میرا وقت آگیا تو مجھے کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں، میں ان کو اپنے بعد خلیفہ بنانے کے لیے نامزد کرجاؤں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس نامزدگی کے بارے میں مجھ سے پوچھا تو میں عرض کرسکوں گا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے، اور اس امت کے امین ابوعبیدہ ابن الجرّاح رضی اللہ عنہ ہیں (مسند احمد ص ۱۸) جب شام کے علاقے میں وہ تاریخی طاعون پھیلا جس سے ہزاروں افراد لقمۂ اجل بنے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا جس میں انہیں فوراً مدینہ آنے کی تاکید کی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اطاعت امیر کے ساری زندگی پابند رہے، لیکن اس خط کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے اس طاعون زدہ علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہ خط پڑھ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: ''میں امیر المؤمنین کی ضرورت سمجھ گیا، وہ ایک ایسے شخص کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو باقی رہنے والا نہیں ہے۔ اور پھر اس خط کے جواب میں مدینہ آنے سے معذرت کی اور لکھا کہ امیر المؤمنین میں مسلمانوں کے ایسے لشکر کے درمیان بیٹھا ہوں جس کے لیے میں اپنے دل میں اعراض کا کوئی جذبہ نہیں پاتا۔ لہٰذا میں ان لوگوں کو چھوڑ کر اس وقت تک آنا نہیں چاہتا جب تک اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارے میں اپنی تقدیر کا

حتمی فیصلہ نہیں فرما دیتا۔ لہٰذا مجھے اپنے اس تاکیدی حکم سے معاف فرما دیجئے اور اپنے لشکر ہی میں رہنے دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے خط پڑھا تو آنکھوں میں آنسو گئے۔ جو لوگ پاس بیٹھے تھے وہ جانتے تھے کہ خط شام سے آیا ہے۔ حضرت عمرؓ کو آبدیدہ دیکھ کر انہوں نے پوچھا: کیا ابوعبیدہؓ کی وفات ہوگئی؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''ہوئی تو نہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہونے والی ہے''۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دوسرا خط لکھا۔ سلام کے بعد لکھا: ''آپ نے لوگوں کو ایسی زمین میں رکھا ہوا ہے جو نشیب میں ہے۔ اب انہیں کسی بلند جگہ پر لے جایئے جس کی ہوا صاف ستھری ہو''۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ خط حضرت ابوعبیدہؓ تک پہنچا تو انہوں نے مجھے بلا کر فرمایا کہ امیر المؤمنین کا یہ خط آیا ہے، اب آپ ایسی جگہ تلاش کیجئے جہاں لشکر کو لے جا کر ٹھہرایا جا سکے۔ میں جگہ کی تلاش میں نکلنے کے لیے پہلے گھر پہنچا تو دیکھا کہ میری اہلیہ طاعون میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ میں نے واپس آ کر حضرت ابوعبیدہؓ کو بتایا۔ اس پر انہوں نے خود تلاش میں جانے کا ارادہ کیا اور اپنے اونٹ پر کجاوہ کسوایا، ابھی آپ نے اس کی رکاب میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ آپ پر بھی طاعون کا حملہ ہو گیا اور اسی طاعون کے مرض سے آپ نے ۱۸ھ میں وفات پائی۔ **رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ و ارضاہ .**

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

چیچہ وطنی میں چوتھے مرکزِ احرار ''مسجدِ ختم نبوت'' کا قیام

رحمٰن سٹی ہاؤسنگ سکیم اوکانوالہ روڈ چیچہ وطنی میں مسجد ختم نبوت کے لیے ایک کنال جگہ رحمٰن سٹی کے منتظمین نے دارالعلوم ختم نبوت (رجسٹرڈ) چیچہ وطنی کو عطیہ کی ہے جس کا سنگِ بنیاد 10 مئی 2006ء کو قائدِ احرار سید عطاء المہیمن بخاری نے رکھا۔ مسجد و سنٹر کی جگہ سے متصل ڈسپنسری لائبریری اور دفتری ضروریات کے لیے جماعت نے پانچ مرلے کا پلاٹ خریدا ہے جس کی ادائیگی ان شاء اللہ دسمبر 2006ء تک کرنی ہے۔ جملہ اہل خیر سے تعاون کی درخواست ہے۔

نوٹ براہِ کرم رقم بھیجتے وقت مد کی صراحت ضرور فرمائیں

ترسیلِ زر اور رابطہ کے لیے

عبداللطیف خالد چیمہ دفتر مجلس احرار اسلام دارالعلوم ختم نبوت جامع مسجد چیچہ وطنی پاکستان

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر: 1306 نیشنل بینک آف پاکستان جامع مسجد بازار چیچہ وطنی بنام دارالعلوم ختم نبوت

فون نمبر: 040-5482253 موبائل: 0300-6939453

منجانب: تحریک تحفظ ختم نبوت (شعبۂ تبلیغ) مجلس احرار اسلام جامع مسجد بلاک نمبر 12 چیچہ وطنی

سیّد عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ

خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

شراب و شاہد و مطرب ' مُغنیہ بدبُو
یہ میرے عہد کا جوبن ' یہ پھیلے گا ہر سُو
فساد و فتنہ و دشنہ ' عذاب ِ مہنگائی
سوائے اس کے غریبوں کو عقل کیا آئی
ہلاک ِ کوئے سیاست غریب ہے اب بھی
سوارِ دوشِ حکومت امیر ہے اب بھی

یہ امیروں کی دنیا ہے' جاگیرداراس دنیا کے بدکردارا یکٹر ہیں۔اور سرمایہ داراس دنیا کے خرکار'.....گناہ کولذیذ انہوں نے بنایا' گناہ کو کلچر میں انہوں نے تبدیل کیا' گناہ کوشعوری دنیادی' گناہ کو وقت کی ضرورت بنادیا۔گناہ کوآرٹ اورفن کا درجہ دیا۔بدمعاش' بدقماش اور سفلۂ قلاش کوفنکار کا رتبہ دیا۔اسے سماج میں معزز بنایا۔اسے ملک کا نمائندہ وسفیر کہا اسے بیرون ملک اپنے بھڑوے پن کے مظاہرے کے لیے تمام سہولتیں مہیّا کیں۔اسے میڈیا کے ذریعے شہرت بخشی۔اس کی مالی وقانونی سرپرستی کی' زندقہ والحاد کے لاشے کوسؤسؤ' شراب وکباب سے توانا کیا،یعنی ابلیس کو ننگا ناچنے کے لیے آرٹ کونسلوں کے سٹیج مہیّا کئے۔

قراردادِ پاکستان اور پاکستان کا مطلب کیا' ۶۸ برسوں میں دُم دارستارہ بن کر گیا۔اس کے طلوع ہوتے ہی وزارتِ داخلہ پرکپکپی طاری ہوجاتی ہے' ابرو کے زاویے بننے لگتے ہیں' ہونٹ پھڑ پھڑانے لگتے ہیں' گلا چیخنے' چنگھاڑنے کا فرضِ منصبی ادا کرنے لگتا ہے' پاؤں پٹخنے کا عمل تیز ہوجاتا ہے' خدا کی زمین پر تکبر وغرور بے قابو ہوجاتا ہے' انسانی قتل و غارت گری شیوۂ اقتدار واختیار بن جاتا ہے' یہ نام نہاد مسلمان ہلاکو اور چنگیز خاں کی یاد تازہ کردیتا ہے۔یہ اپنے اندر کی چنگیزی تاریکی کو کمزوروں' ضعیفوں پر مسلّط کرتا ہے۔نقّاش پاکستان نے فرمایا ہے

''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات''

''کلپر وں'' کو وزارت داخلہ' جان کی امان دیتی ہے۔انہیں اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے' اپنی حفاظت میں خسروانہ عنایتوں کے سایۂ عاطفت میں وہ سب کچھ کرنے دیا جاتا ہے جو رمزی یوسف اور اعظم طارق سے منسوب کیا جاتا ہے۔بھیڑ کو بھیڑیا کہا جاتا ہے۔بھیڑیا بھوکا ہو تو شیر پر بھی جھپٹتا ہے۔جس طرح مغلوب بلّی انسان پر جھپٹتی ہے۔

یہ ہے جمہوری تحفہ' بیسیوں انسانوں کے قاتل امن کی فاختائیں اڑا رہے ہیں اور غریبوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہے..... پاکستان کے تیس افراد کو ایک جاگیردارنی سے دنیا کے سب سے بڑے جگّے امریکہ نے مانگا۔اس نے

برضا و رغبت اس گناہِ بارضا کو قبول کیا!..... میں پوچھتا ہوں کہاں ہیں جمہوریت کے فرزندان دوں نہاد؟ ..... کہاں ہیں وہ نام نہاد سرچشمۂ اقتدار عوام؟ ..... کہاں ہیں وہ عوام کالانعام' جو کہتے ہیں کہ عوام کی حکومت' عوام کے ذریعے عوام پر!..... ان عوام کو بچانے کے لیے ''عوام'' کہاں کھو گئے؟ عوامی نمائندے کہاں مر گئے؟ یہاں کوئی قذافی نہیں! کوئی شاہ فہد نہیں! کوئی شریعت مداری! کوئی قومی غیرت وحمیّت کا پیکر؟ کوئی انسانی محبتوں کا خوگر؟

نفیس خلیلی نے ۱۹۴۹ء میں آج کی تصویریں دیکھ لی تھیں' کچھ ایسا ہی لگتا ہے:

پاکستان ہے یا قصاب خانہ

سن ۴۹ء کا کہا' حکمرانوں نے قسط وار سچ کر دکھایا' شاید نفیس خلیلی شاعر نہیں' نجومی اور علامت شناس تھا' اس نے اس فرزندِ ناہموار کے ''چُپڑ ے چپڑے چکنے چکنے'' گال دیکھ کے' اسے جان پہچان کے' پیشین گوئی کر دی تھی اور خود جاگیرداروں کے ذاتی اور بالکل پرائیویٹ ''سیاسی عقوبت خانے'' کی نذر ہو گیا تھا' اسے پنجاب کے ایک خبیث' بدنظر جاگیردار کی نظر کھا گئی تھی' جیسے جالندھر کے شمس الحق کو بھوکا ''اقتداریا'' پی گیا تھا۔ جاگیردار اقتداریئے کی یہ عادتِ بد ہے کہ یہ نشۂ اقتدار میں اکثر ضعیف انسانوں کو پرانی شراب سمجھ کر پی جاتا ہے۔ یہ صرف طاقت کو اپنے کباب حکومت میں ہڈی سمجھتا ہے۔ اگر ہڈی ''مڑکن'' ہو تو اسے بھی چبا جاتا ہے۔ آخر شرابِ ناب کے ساتھ اسے کباب بھی چاہیے اور یہ کباب اسے وزارتِ داخلہ ہی دے سکتی ہے۔ موجودہ روح فرسا گرانی عوام کا کباب ہی تو بنا رہی ہے..... کباب ان کا بن رہا ہے' درد میرے جگر میں اٹھ رہا ہے۔ ان عوام کو جمہوریت کا مروڑ تو اٹھتا ہے جمہوری حقوق کا نہیں۔ یہ اپنے حقوق کے لیے پیچ و تاب کھا کے' جھنجھلا کے' اقتدار کے بدنما' مکروہ' حقیر' عوام کے معتوب چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید نہیں کرتے۔ یہ اس بت کی پوجا کرتے ہیں جو انہیں نفع نہیں دیتا بلکہ نقصان دیتا ہے جو انہیں گناہ کی معرفت بخشتا ہے' جو جھوٹ' وعدہ خلافی' سود اور حرام کاریوں کے ذریعے اقتدار کی تنکنائے سے گزرنے کا ہنر دیتا ہے جو ''سرچشمۂ اقتدار'' کو بھوک' تنگدستی' بیماری' ضعیفی' بے چارگی اور جہالت دیتا ہے۔ یہ ایسا بتِ کافر ہے جو عذابوں کو شرابوں میں بدل دیتا ہے' یہ ایسا بت طناز ہے جو تعلیم کے لیے ناروے سے ملنے والی امداد کو بھی اپنی مکاریوں' خباثتوں اور کمینہ خصلتوں کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ دھوکہ اور فریب کی ایسی کمین گاہ سجاتا ہے جس میں بڑے بڑے ابوداؤد اور اس کے ہم قافیہ اقتدار کا ''جھونگا'' اور قافیہ بن کے رہ جاتے ہیں:

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

بے اختیار لب پہ آ جاتا ہے۔ بہ ظاہر دین کے اجارہ دار اور مذہبی ڈیرے دار جب گھٹنوں کے بل گر جائیں گے اور اقتدار کے آگے کورنش بجالائیں گے تو دنیا کے طلب گاروں سے گلہ کیوں؟ ان کی زبانِ حرص و آز اگر اقتدار کی دہلیز چاٹنے لگے تو ملال کیسا؟..... اب تو قاضی صاحب بھی نواز شریف کو محبت کا مشروط سندیسہ دیتے ہیں!

خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

(۸ مئی ۱۹۹۵ء)

سید محمد معاویہ بخاری

''یادوں کی برات''

عہد حاضر کے ناقص العمل انسانوں کو اپنی یادیں لکھنے کے بجائے صرف جمع کرنے تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ ورنہ جوش وجذبہ کی بے احتیاطی سے وہ سب کچھ نوکِ قلم تک چلا آتا ہے جو بہر حال باعثِ فخر اور قابل افشا نہیں ہوتا۔ ایک بڑے ادیب ودانشور کے بقول یادیں تو موسموں کی طرح ہوتی ہیں۔ کبھی مہربان اور کبھی غضب ناک۔ انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے سے پہلے ہزاروں بار بھی سوچنا پڑے تو سوچ لینا چاہیے کیونکہ ہر مہربانی اور ہر ابتلاء قابل تحریر نہیں ہوا کرتی۔ بعض اوقات انکشافات کی تہلکہ خیزی سے عارضی نام وری تو مل جاتی ہے مگر ضبط واحتیاط کے طفیل نصیب ہونے والی عزت حاصل نہیں کی جاسکتی۔

چند روز پہلے صدر مشرف کی کتاب IN THE LINE OF FIRE ان کے حالیہ کامیاب ترین اور طویل ترین دورۂ امریکہ کے دوران منظر عام پر آئی اور عالمی میڈیا کے سامنے باضابطہ طور پر ایک تقریب رونمائی میں اسے اہل فکر ودانش کے سامنے پیش کیا گیا۔ آج کئی دن بیت رہے ہیں کہ دنیا بھر میں اس کتاب کے مندرجات زیر بحث ہیں۔ نرم وگرم تبصروں ،تجزیوں نے کتاب کی شہرت کو مزید چار چاند لگا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ عالمی مارکیٹ تو رہی ایک طرف پاکستان بھر میں تمام بڑے شہروں کے بعد اب چھوٹے شہروں میں بھی صرف چند دنوں کے اندر کتاب کی سینکڑوں کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ وہ دکاندار جو علمی وادبی کتابیں فروخت کرنے کی جسارت کرتے ہیں اور اس جرم کی پاداش میں پورے سال کے دوران علم وادب کی شاہکار کتابوں کے درجن بھر سے زائد نسخے فروخت نہیں کر پاتے' ان دنوں بہت خوش ہیں۔ انہیں خوشی ہے کہ سبب کوئی بھی ہو مگر اُن کی دکانوں میں گہما گہمی بڑھ گئی ہے۔ لوگ صدر صاحب کی کتاب جوق در جوق خریدنے آرہے ہیں اور ان کی ایک کتاب کے ساتھ اور بہت کچھ بھی بک رہا ہے۔ دکانداروں کا کہنا ہے کہ صدر مشرف کی کتاب اُن کے کاروباری حجم میں اضافے کا باعث بنی ہے۔ جبکہ خود صدر مشرف کا بھی یہی کہنا ہے کہ میں اپنی کتاب کو بے روزگاری کے خاتمے کے لیے استعمال کروں گا۔ یعنی وہ اپنی کتاب سے حاصل ہونے والی آمدنی کو فلاحی مقاصد کے لیے استعمال کریں گے اور اس کے لیے ایک فاؤنڈیشن قائم کی جائے گی جس کا مقصد محروم طبقوں کے لیے فلاحی اقدامات کرنا ہوں گے۔ صدر مشرف کے بقول وہ ایک ایسا ادارہ تشکیل دینا چاہتے ہیں جو نادار لوگوں اور بیروزگار نوجوانوں کے لیے تعلیم اور روزگار کا بندوبست کر سکے۔ (روزنامہ ''جنگ'' ۲۷ ستمبر ۲۰۰۶ء)

صدر مشرف خوش ہیں کہ انہیں اپنی کتاب کے حوالہ سے نہ صرف عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ ایک اخباری اطلاع کے مطابق صدر محترم کو اس کتاب کی مد میں چھے کروڑ ڈالر کی خطیر رقم بھی ادا کی گئی ہے۔ ہماری قومی تاریخ میں کسی صدرِ مملکت کی جانب سے لکھی گئی شاید یہ پہلی کتاب ہوگی جس کا مقصد نادار لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ ورنہ کتاب تو Friends, not masters کے عنوان سے صدر ایوب خان نے بھی لکھی تھی اور اتفاق یہ کہ اپنے عہدِ صدارت کے دوران ہی لکھی تھی

''اِن دی لائن آف فائر'' صدر مشرف کی یادداشتوں پر مشتمل ان حالات وواقعات کا ضمیمہ ہے جو بے جا سنسنی خیزی کے باوجود کہیں کہیں حقائق سے بھی مربوط ہے۔ بقول چودھری شجاعت حسین صاحب کے ''صدر محترم کی کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کوئی چیز نہیں چھپائی۔ لوگ تو اپنی بیویوں سے سچ چھپاتے ہیں مگر صدر نے تو اپنے معاشقوں کو بھی بے نقاب کیا۔ اور یہ بڑی بات ہے۔ چودھری صاحب کے بقول اس کتاب میں سوائے سچ کے اور کچھ نہیں۔ چودھری صاحب کا کہنا ہے کہ لوگوں کو صدرِ مملکت کی کتاب ضرور پڑھنی چاہیے تب ہی انہیں سمجھ آئے گی کہ اس میں کیا ہے؟''

(روزنامہ ''اسلام'' ۷/اکتوبر ۲۰۰۶ء)

جبکہ ناقدین برملا کہہ رہے ہیں کہ کارگل سے لے کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان تک اور نائن الیون سے لے کر طالبان تک اس کتاب کے مندرجات میں سچ کے سوا باقی سب کچھ ہے۔ کل ایک صحافی دوست بتا رہے تھے کہ دوفوجی صدور کی کتابوں کی لفظی ترتیب ایک ہی خاندان کے قابل ترین سوانح نگاروں کے ہاتھوں سرانجام پائی ہے۔ مرحوم الطاف گوہر اور ان کے خانوادے میں ہمایوں گوہر کا یہ اعزاز اپنی جگہ انفرادیت کا حامل ہے۔ صدر مشرف کی کتاب ان کے بقول حقائق کا مجموعہ ہے انہوں نے فوج وسیاست کی دوہری زندگی میں جو کچھ دیکھا، سمجھا اسے من وعن رقم کر دیا۔ یعنی یادوں کی ایک بارات ہے جو صحن چمن میں اچانک اتر آئی ہے۔ بے رونق گلی کوچوں میں اچانک برات آجائے تو چہ میگوئیاں ہوتی ہی ہیں۔ کیسے، کب اور کیوں جیسے سوالات ضرور اٹھتے ہیں۔ اچانک شور برپا ہونے پر لوگ گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ رونق وہنگامہ دیکھ کر بے وجہ کے رقیب طعنہ زن ہو جاتے ہیں۔ رنجش، حسد ورقابت کے ناہموار جذبوں کو انگیخت کرتی ہے۔ چنانچہ تنقید کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ایسے سنگین نوعیت کے الزامات واتہامات سننے میں آتے ہیں کہ الآمان والحفیظ۔ ''اِن دی لائن آف فائر'' بھی یادوں کی برأت سجائے ملک کے تناؤ بھرے سیاسی ماحول میں اچانک ہی نمودار ہوئی ہے۔ اس لیے ابال نکلتے اور طنز آمیز کوسنوں کی شدت میں کمی آتے کچھ دن تو ضرور لگیں گے۔

یادش بخیر! معروف شاعر جوش ملیح آبادی نے اپنی سوانح عمری ''یادوں کی برات'' کے عنوان سے ہی لکھی تھی۔ جوش ملیح آبادی بھی ادبی دنیا میں بے لچک جنرلی اطوار کی حامل شخصیت ہی سمجھے جاتے تھے۔ ایک بزرگ، ادیب وشاعر فرما رہے تھے کہ جوش مرحوم کے بہت قریب رہنے والے چند ادیبوں نے ''یادوں کی برات'' میں پھوٹتے ست رنگے پٹاخوں کو زیادہ پسند نہیں کیا تھا۔ اور کچھ ترمیم وتغیر کی درخواست کی تھی۔ جسے حضرتِ جوش نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ''آجاتے ہیں احمق کہیں کے..... بھئی! کتاب میری ہے آپ کی نہیں۔ اس میں درج شدہ واقعات بھی میرے ہیں۔ لوگ اعتراض کریں گے تو مجھ پر آپ کیوں خواہ مخواہ میں چند لوگوں کی مدارتِ طبع کے لیے ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔'' جوش ملیح آبادی اپنے وقت کے روشن خیال انسان تھے سو روشن خیالی پھیلاتے رہے۔ اس پر انہیں کوئی جھجک تھی اور نہ ہی کوئی ندامت۔ آخر جوش صاحب کی کتاب چھپ گئی اور لطف یہ کہ سب سے پہلے ناقدین کے گروہ نے یہ کتاب خریدی تھی۔ اب ایک دوسرے سے ملتے تو ہونٹوں پر ذومعنی مسکراہٹ لیے اور اشاروں کنایوں میں پوچھتے..... کہو کیسی رہی؟ ہزاروں تنقیدی تبصروں کے باوجود اتنا سب نے مانا

کہ جوش نے جھوٹ نہیں لکھا تھا۔ آخر کو اُن کی سوانح عمری تھی اور ادبی تاریخ کا حصہ بننے جا رہی تھی۔ لہٰذا کشکولِ حیات میں جو کچھ جمع تھا سارے کا سارا زینتِ قرطاس بنا ڈالا۔ اب کچھ لوگ ''یادوں کی برات'' میں درج شدہ واقعاتی سچائیوں کو ''کوک شاستر'' سے تعبیر کرتے ہیں تو ان کی مرضی۔ ناقد اپنی تنقید کے لیے آزاد ہے۔ مگر اتنا تو وہ بھی جانتا ہے کہ شاستروں میں لکھی گئی معلومات پورا سچ بے شک نہ ہوں مگر سفید جھوٹ بھی ہرگز نہیں ہوتیں۔ پتا نہیں کیوں ایسا لگتا ہے کہ جوش صاحب کی ''یادوں کی برات'' اور صدر صاحب کی ''اِن دی لائن آف فائر'' میں کئی ابواب کھلی سچائیوں کے افشاء کی قدرِ مشترک رکھتے ہیں۔ جوش صاحب کے ہاتھوں بے چارے مولوی صاحب سمیت حکیموں اور دانشوروں اور استادوں کی جیسی درگت بنتی رہی ''اِن دی لائن آف فائر'' میں کم وبیش ایسے ہی درگت آمیز واقعات کی تفصیل صدر مشرف نے نائن الیون کے پس منظر میں کیے گئے اپنے اقدامات کے حوالے سے پیش کی ہے۔ دینی مدارس، دینی تنظیمیں، طالبان، نظام تعلیم سمیت بہت کچھ جو تختۂ مشق بنا' اس کا تذکرہ انہوں نے بلاکم وکاست کر دیا۔ رہ گئی بات حکیموں اور دانشوروں کی تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے وہ جوش کی تفننِ طبع کا ہدف بننے والے حکیم صاحب اور کالج کے پرنسپل سے مختلف نہیں ہے۔ جو روشن خیال مذمومات کا شکار بنتے رہے۔

کتابیں کیوں لکھی جاتی ہیں؟ اس حوالے سے بحث شاید بہت طویل ہو جائے مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایوب خان کی ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز''، جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' اور پرویز مشرف کی ''اِن دی لائن آف فائر'' جیسی کتابیں وقتی سنسنی خیزی کا باعث تو ضرور بن سکتی ہیں مگر ان کا شمار ان کتابوں میں نہیں کیا جا سکتا جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی

صدر صاحب کی یادداشتیں ان کے عزائم کی آئینہ دار ہیں۔ جو کچھ وہ کر چکے' اسے بیان کر دیا گیا ہے اور آنے والے دنوں میں جو کچھ ہونے جا رہا ہے' اس کی ہوش رُبا تفصیلات جاننے کے لیے ہمیں ایک اور ''یادوں کی برات'' کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یعنی ''اِن دی لائن آف فائر'' کا دوسرا ایڈیشن۔ لہٰذا آئندہ پانچ برسوں کے باوردی عہدِ صدارت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتظار کیجیے کہ ہم اس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔

محمد احمد حافظ

سویرا طلوع ہو رہا ہے

ہر نیا دن طلوع ہونے کے ساتھ افغانستان کے حوالے سے نئی خبریں پڑھنے کو مل رہی ہیں اور ان خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ افغانستان میں طالبانِ عالی شان کی مزاحمت عروج پر ہے۔ کابل اور قندھار خودکش حملوں کی زد میں ہیں۔ ان سب میں آج (۴/اکتوبر ۲۰۰۶ء) کی خبر زیادہ اہم ہے کہ خوفزدہ برطانوی فوج نے موسیٰ قلعہ کا علاقہ طالبان کے حوالے کر دیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے:

''افغانستان میں تعینات برطانوی فوج نے پے در پے حملوں کی وجہ سے طالبان سے جنگ بندی کا خفیہ معاہدہ کر کے اپنے زیر کنٹرول موسیٰ قلعہ کا علاقہ خالی کر کے اسے مقامی طالبان کے حوالے کر دیا ہے۔''

برطانوی اخبار ''دی ٹائمز'' نے سینئر برطانوی حکام کے حوالے سے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ جنوبی افغانستان کے علاقے موسیٰ قلعہ میں گزشتہ دو ماہ سے طالبان کی طرف سے شدید حملے کیے جا رہے تھے۔ جن میں برطانوی فوج کو جانی نقصان کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان حملوں میں شدت کے باعث برطانوی فوج کی ایک ٹیم نے طالبان شوریٰ کے ساتھ مذاکرات کیے جن کے تحت یہ طے پایا کہ علاقے میں امن کے لیے برطانوی فوج یہ علاقہ مکمل طور پر خالی کر دے گی اور اس کا کنٹرول مقامی طالبان عمائدین کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس معاہدے کا برطانوی فوج کی اکثریت نے خیر مقدم کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں ہر وقت ایک ان دیکھے خوف کا سامنا تھا جس کے باعث وہ اپنے فرائض سرانجام نہیں دے سکتے تھے۔ موسیٰ قلعہ معاہدے کو دیکھتے ہوئے ہلمند صوبے کے دیگر عمائدین بھی اسی طرح کے معاہدے کے لیے کوشاں ہیں۔

(روزنامہ ''اسلام''۔ ۱۳/اکتوبر ۲۰۰۶ء)

یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ امریکی افواج کا ایک معتد بہ حصہ پہلے ہی افغانستان سے چپکے چپکے راہ فرار اختیار کر چکا ہے اور افغان علاقوں کو اتحادیوں کے مختلف ممالک کی افواج کے سپرد کر چکا ہے۔ طالبان کے پے در پے حملوں سے اتحادیوں کا مورال دن بدن گر رہا ہے۔ امریکہ جو بڑے طنطنے، ہمہمے اور غلغلے کے ساتھ افغانستان آیا تھا اور اس نے ہیبت ناک کارپٹ بمباری کر کے بستیوں کی بستیاں ملیامیٹ کر دی تھیں، اب افغانستان میں دہشت گردی کی قیادت ایساف کے سپرد کر چکا ہے۔ اس کے آٹھ ہزار میں سے ۵۹۵۰ فوجی واپس جا چکے ہیں۔ امریکی افواج کو اس بات کا مکمل ادراک ہو چکا ہے کہ وہ طاقت کے بل پر طالبان سے جنگ نہیں جیت سکتے۔

صدر بش کی جماعت ری پبلکن کے سینٹ میں پارلیمانی لیڈر اور متوقع صدارتی امیدوار بل فرسٹ کا یہ بیان

اخبارات کی زینت بن چکا ہے:

''طالبان جنگجو بہت زیادہ ہیں اور عوام میں بے پناہ مقبول ہیں' اس لیے انہیں فوجی شکست نہیں دی جا سکتی۔''

یہ اعترافِ شکست نہیں تو اور کیا ہے؟ حیرت تو یہ ہے کہ امریکہ اپنے اور اتحادیوں کے تمام لاؤ لشکر کے باوجود روس جتنی استقامت بھی نہ دکھا سکا اور اپنے دوستوں کو منجدھار کے بیچ چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔

قابض و غاصب افواج کو افغانوں کی جس نسل سے مزاحمت کا سامنا ہے' وہ ایمان و یقین سے معمور اور فقرِ غیور سے مالا مال ہے' اس نسل کا مطمح نظر مادیت نہیں' رضاالٰہی اور انعام خداوندی ہے۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ زندہ تو زندہ مر کر بھی کامیاب و کامران رہیں گے..... خودکش حملہ آور جب اپنے ہدف کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا جوش و خروش اور جذب و کیف کا عالم دیدنی ہوتا ہے..... جس فدائی کے اعتماد کا یہ عالم ہو کہ وہ ہدف کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کے لیے پشتو میں اعلان کرے کہ ''میں فدائی ہوں، تم بچ جاؤ'' اور یہ کہہ کر غاصب افواج پر ٹوٹ پڑے' اس کے یقین و عزم کو کون سی مادی قوت شکست دی سکتی ہے؟ اس بات کا اعتراف تو جنرل پرویز نے بھی کیا ہے کہ مجھ پر خودکش حملہ کرنے والا فدائی خود کو بارود سے اڑانے سے عین ایک لمحہ قبل مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

یہ بات کہ افغانستان میں طالبان دوبارہ تقویت پکڑ رہے ہیں' پچھلے کئی مہینوں سے کہی جا رہی ہے اور اس بات کا اعتراف اتحادی افواج کو بھی ہے۔ گزشتہ دنوں برطانوی وزیر دفاع ڈیس براؤن نے ''رائل یونائیٹڈ سروسز انسٹی ٹیوٹ تھنک ٹینک'' سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

''طالبان کی طرف سے حیران کن شدید مزاحمت کے بعد افغانستان میں نیٹو کی ساکھ خطرے میں پڑ گئی ہے طالبان کی مزاحمت توقعات سے کہیں زیادہ سخت ہے۔''

افغانستان میں متعین برطانیہ کے ہی ایک میجر جان سوئفٹ نے برطانوی فوج کے ایک میگزین میں لکھا ہے کہ افغانستان میں برطانوی فوج کا جانی نقصان سرکاری طور پر بیان کردہ اعداد و شمار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ری پبلکن کے پارلیمانی لیڈر کا اعتراف تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ متوقع طور پر افغان صدارتی محل میں مقیم حامد کرزئی شدید بوکھلاہٹ کے عالم میں پاکستان پر دراندازی کے الزامات عائد کر رہے ہیں۔ وہ پاکستانی مدارس کو دہشت گردی کے اڈے قرار دے رہے ہیں اور ان کا لہجہ دن بدن تند ہوتا جا رہا ہے۔ حامد کرزئی اگر اپنے ہی قائم کردہ کمیشن کی رپورٹ غور سے پڑھ لیتے تو بہت کچھ آشکارا ہو جاتا۔ حامد کرزئی کے وزیر داخلہ ضرار احمد مقبل کی سربراہی میں قائم اس جائزہ کمیشن نے جو رپورٹ دی' اس کا خلاصہ یہ ہے:

''افغانستان میں طالبان کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں کا سبب عوام اور حکومت کے درمیان عدم اعتماد کی فضا ہے' جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غیر ملکی افواج کارروائیاں کرنے سے قبل مقامی انتظامیہ کو آگاہ کرتی ہیں نہ

افغان روایات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ کسی بھی کارروائی کے دوران چادر اور چاردیواری کا تقدس بحال نہیں رکھتیں۔ جارحانہ انداز میں افغان خواتین اور بچوں کی تلاشی لینا شروع کر دی جاتی ہے۔ سیکورٹی فورسز خصوصاً پولیس کا رویہ عوام کے ساتھ انتہائی غیر مناسب ہے۔ افسران لوٹ مار میں ملوث ہیں، غیر ملکی میڈیا افغانستان میں فحاشی وعریانی پر مبنی کلچر کو فروغ دے کر افغان اور اسلامی روایات کا کھلم کھلا مذاق اڑا رہا ہے۔ ملک کے تمام چھوٹے بڑے سرکاری اداروں میں رشوت خوری، اقرباء پروری اور کرپشن عام ہے، ملک بھر کا عدالتی نظام مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ غیر ملکی این جی اوز کے نمائندے شہروں میں اپنی عیاشیوں میں مصروف ہیں اور انہیں دیہی علاقوں میں جانے کی توفیق نہیں ہوتی۔''

اس واضح رپورٹ کے بعد بھی حامد کرزئی طالبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور تیز ترین عسکری کارروائیوں کا ملبہ پاکستان پر ڈالیں تو اسے ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'' کیوں نہ کہا جائے۔

حامد کرزئی کے واویلے کی تو سمجھ آتی ہے کہ ان کا راتب اسی لب ولہجہ اور پراپیگنڈے پر مہیا ہوتا ہے مگر چند روز قبل جنرل پرویز نے جو بیان جاری کیا کہ میں طالبان کو بڑا خطرہ بنتے دیکھ رہا ہوں اور یہ کہ آئی ایس آئی کے بعض سابق افسران طالبان کی مدد کر رہے ہیں......آپ اسے کیا نام دیں گے؟ ہمارے خیال میں یہ دونوں (صدور) وہ شخصیتیں ہیں؛ جنھوں نے اپنے اپنے ملک وقوم سے بے وفائی کر کے اقتدار سنبھالا۔ اپنے ہم وطنوں کو طشتریوں میں سجا کر امریکیوں کے حوالے کیا۔ عوام میں ان کی جڑیں نہیں، ان کا ملجا و ماویٰ صرف امریکہ ہے...... یہ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ ان کا آقا مرحلہ وار راہِ فرار اختیار کر رہا ہے، اتحادیوں میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے، گلی کے سب راستے بند ہو رہے ہیں، طویل اقتدار کی آرزو ملیا میٹ ہو رہی ہے اور حسین خوابوں کی بچھائی گئی بساط؛ تیزی سے لپیٹی جا رہی ہے......طالبان کی مزاحمت زور پکڑ رہی ہے، گھپ اندھیرے میں جب کچھ سجھائی نہیں دے رہا تو حامد کرزئی پاکستان کے خلاف واویلا کر رہا ہے اور جنرل پرویز اپنے ہی ملک کو ملزم سے مجرم ثابت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں......اہل باطل تو یوں ہی تلملاتے رہیں گے مگر ایمان والوں کو خوشخبری ہو کہ سویرا عنقریب طلوع ہوا چاہتا ہے۔

ماہانہ مجلس ذکر واصلاحی بیان

ابن امیر شریعت حضرت پیر جی
سید عطاء المہیمن بخاری دامت برکاتہم
(امیر مجلس احرار اسلام پاکستان)

5 نومبر 2006ء
اتوار بعد نماز مغرب

دفتر احرار 69/C
وحدت روڈ نیو مسلم ٹاؤن لاہور

نوٹ: ہر انگریزی ماہ کی پہلی اتوار کو بعد نمازِ مغرب مجلس ذکر واصلاحی بیان ہوتا ہے

تحریک تحفظ ختم نبوت (شعبہ تبلیغ) مجلس احرار اسلام لاہور فون: 042-5865465

یاسر محمد خان

سیاسی بداعمالیوں کی دستاویز
IN THE LINE OF FIRE

جناب گوہر الطاف پاکستان کے سینئر بیوروکریٹ، شاعر اور ادیب تھے۔ انہوں نے پاکستان بننے کے فوراً بعد سول سروس جوائن کی اور اسسٹنٹ کمشنر سے فیڈرل سیکرٹری کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ایوب خان کے دور میں وہ پاکستان کے سیکرٹری اطلاعات تھے۔ ایوب خان کا اقتدار جب جوبن پر تھا تو فیلڈ مارشل نے اپنی خودنوشت لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس خود نوشت کے لیے برطانیہ کا ایک صحافی منتخب کیا گیا۔ اس صحافی نے اس وقت ایک ملین ڈالر کے قریب معاوضہ لیا۔ جس کے بعد اس کتاب کا عمل شروع ہوگیا۔ وہ صحافی وقتاً فوقتاً پاکستان آتا رہتا۔ وہ ایوب خان کے انٹرویوز کرتا، سیکرٹ ڈاکومنٹ (خفیہ کاغذات) لیتا اور واپس چلا جاتا۔ ایک سال کی مسلسل کوشش اور محنت کے بعد اس صحافی نے کتاب مکمل کر کے ایوب خان کے حوالے کر دی۔ صدر ایوب خان یہ کتاب پڑھنے کے بعد حیران رہ گئے اور کہنے لگے: ''یہ کتاب میری نہیں۔''

ایوب خان کا کہنا تھا اس کتاب میں ان کی شخصیت پوری طرح نظر نہیں آتی۔ یہ کتاب ایک خودنوشت کم اور ایک سرکاری اور تحقیقی دستاویز زیادہ نظر آتی ہے۔ ایوب خان نے الطاف گوہر کو بلوایا اور انہیں حکم جاری کیا: ''میں اس کتاب سے مطمئن نہیں ہوں۔ اب یہ کتاب آپ لکھوائیں گے۔'' یوں صدر ایوب خان کی خودنوشت وزارتِ اطلاعات کی ذمہ داری بن گئی۔

الطاف گوہر نے شروع میں چند سینئر صحافیوں، دانشوروں اور مصنفوں کا ایک پینل تشکیل دیا اور اس کتاب کی ذمہ داری اس پینل کو سونپ دی۔ یہ پروجیکٹ بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ یوں آخر میں فیصلہ ہوا صدر ایوب خان کی خودنوشت جناب الطاف گوہر خود تحریر کریں گے۔ اس کتاب کے معاملے میں تین چیزیں طے ہوئیں۔ نمبر ایک: یہ کتاب نتھیا گلی میں لکھی جائے گی۔ اس وقت نتھیا گلی پاکستان کا گرمائی دارالحکومت ہوتا تھا۔ صدر ایوب خان گرمیوں میں نتھیا گلی منتقل ہو جاتے تھے۔ وہاں ایک ایوانِ صدر تھا، جس میں صدر کا سٹاف رہتا تھا۔ صدر گرمیوں میں تمام میٹنگز نتھیا گلی میں کرتے تھے۔ نمبر دو: صدر صاحب شروع میں الطاف گوہر کو ایک طویل انٹرویو دیں گے۔ یہ انٹرویو ٹائپ کیا جائے گا، صدر صاحب اس کا جائزہ لیں گے اور اس جائزے کے بعد الطاف گوہر کتاب پر کام شروع کر دیں گے۔ نمبر تین: اس کتاب کے تین باب الطاف گوہر خود تحریر کریں گے۔ اس پلان کے بعد کتاب پر کام شروع ہوگیا۔ صدر چند دنوں کے لیے نتھیا گلی منتقل ہوگئے اور الطاف گوہر تین چار ٹائپسٹوں کے ساتھ ایوانِ صدر پہنچ گئے۔ انہوں نے صدر کے انٹرویوز کرنا شروع کر دیئے۔ اس کتاب پر چودہ ماہ کام جاری رہا۔ الطاف گوہر نے راقم کو بتایا: ''جب صدر ایوب کا انٹرویو ختم ہوا تو ہمارے پاس صدر کی زندگی کے بارے میں ۴۰۰ صفحات جمع ہو چکے تھے۔ میرے لیے یہ کام انتہائی مشکل تھا کیونکہ میں نے کتاب کے سائز، پاکستان کے امیج اور صدر

صاحب کی خواہشات تینوں کا خیال رکھنا تھا۔صدر کی زندگی میں ایسی بے شمار باتیں تھیں جنہیں وہ بہت اہمیت دیتے تھے لیکن اگر پاکستان کے امیج کو سامنے رکھا جاتا تو صدر کے حالاتِ زندگی پاکستان کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوتے۔بہرحال صدر کی خواہش تھی وہ حالات کتاب میں ضرور شامل کیے جائیں جبکہ میں کتاب کو ان واقعات سے بچانا چاہتا تھا۔لہٰذا صدر کو راضی کرنے کے لیے مجھے جتنی محنت کرنا پڑی وہ میں جانتا ہوں۔''

الطاف گوہر کی تحریر کردہ یہ کتاب بعدازاں **"Friends, Not Master"** کے نام سے شائع ہوئی۔کچھ عرصے بعد اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔اس ترجمے کا ٹائٹل ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' تھا۔یہ اپنے دور کی بہت مشہور تصنیف تھی۔اس کتاب نے اندرونِ پاکستان اور بیرونِ پاکستان سیل کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے لیکن ایوب خان کا اقتدار غروب ہوتے ہی یہ کتاب بھی گم نامی کے گوشوں میں تحلیل ہوگئی۔آج اگر آپ پاکستان کی بڑی بڑی لائبریریوں تک میں یہ کتاب تلاش کرنا چاہیں تو آپ کو وہاں بھی اس کا نام ونشان نہیں ملے گا۔آج حالت یہ ہے کہ ایوب خان کے بعد پیدا ہونے والی نسل کا شاید ہی کوئی ایسا نوجوان ہو جس نے یہ کتاب پڑھی ہو یا وہ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔اس کتاب کا المیہ دیکھئے پاکستان کے مورخین تک اس کتاب کو تحقیقی مقالے میں حوالے کے طور پر استعمال نہیں کرتے۔

ہمایوں گوہر الطاف گوہر کے صاحبزادے ہیں۔ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ ملک سے باہر گزرا ہے۔صدر پرویز مشرف کے ایک دوست امریکہ میں کاروبار کرتے ہیں۔ہمایوں گوہر کی بیگم صدر صاحب کے اس دوست کی رشتہ دار ہیں۔ہمایوں گوہر کا اس امریکی پاکستانی دوست کے حوالے سے صدر پرویز مشرف کے ساتھ رابطہ ہوا۔ہمایوں گوہر اس وقت ''نیشن'' اخبار میں کالم لکھتے تھے۔وہ ایک چھوٹی سطح کا میگزین بھی شائع کرتے تھے۔یہ محدود سرکولیشن کا جریدہ تھا جسے کچھ مخصوص لوگ پڑھتے تھے۔ہمایوں گوہر نے صدر پرویز مشرف سے ملاقات سے پہلے ایک اعلیٰ درجے کا میگزین شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔جب ہمایوں گوہر کی صدر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے صدر صاحب کے سامنے اس میگزین کا آئیڈیا رکھا۔صدر صاحب نے انہیں یقین دلایا اگر آپ اس قسم کا میگزین نکالیں تو حکومت آپ کو سپورٹ کرے گی۔اس یقین دہانی کے بعد میگزین شروع ہوگیا۔یہ میگزین تادمِ تحریر شائع ہو رہا ہے اور یہ پاکستان میں سب سے مہنگا میگزین سمجھا جاتا ہے۔ہمایوں صاحب اس میگزین کے ہر شمارے میں پاکستان اور عالمی سطح کی کسی شخصیت کا انٹرویو شائع کرتے ہیں۔ہمایوں کی صاحبزادی ثانیہ گوہر بھی اس میگزین سے وابستہ ہیں۔گزشتہ برس ہمایوں گوہر اور ثانیہ گوہر نے صدر پرویز مشرف سے ایک فیملی انٹرویو کیا تھا۔اس انٹرویو میں صدر نے اپنی زندگی کے بے شمار نرم اور سخت گوشے طشت از بام کر دیئے۔یہ انٹرویو بہت مقبول ہوا۔اس مقبولیت کو جواز بنا کر ہمایوں گوہر نے صدر صاحب کو خودنوشت لکھنے کا آئیڈیا دیا۔صدر صاحب نے یہ تجویز پسند کی۔جس کے بعد صدر کی خودنوشت پر کام شروع ہوگیا۔صدر نے ہمایوں گوہر کو اس خودنوشت کی تمام ذمہ داری سونپ دی۔ایک غیر ملکی صحافی بھی اس کام میں ان کے ساتھ شریک تھا جبکہ چند باب ہمایوں گوہر کی صاحبزادی ثانیہ گوہر نے بھی تحریر کیے۔صدر پرویز مشرف کی خودنوشت اور صدر ایوب کی آٹوبائیوگرافی میں ایک چیز مشترک تھی۔

صدر پرویز مشرف بھی اپنی اس آپ بیتی میں صدر ایوب خان کی طرح اپنی زندگی کے بے شمار ایسے واقعات بیان

کرنا چاہتے تھے جو پروٹوکول کے حوالے سے ٹھیک نہیں لگتے تھے اور ان کی وجہ سے پاکستان کے امیج کو ٹھیک ٹھاک نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ہمایوں گوہر صحافی بیک گراؤنڈ کے شخص ہیں۔ لہٰذا جب وہ اپنے صحافتی پس منظر کو سامنے رکھ کر ان واقعات کو دیکھتے تھے تو انہیں یہ واقعات بہت ٹھیک اور سنسنی خیز محسوس ہوتے تھے۔ لہٰذا اس کتاب کی تحریر کے دوران ہمایوں گوہر کا صحافی اور صدر پرویز مشرف کا جرأت مند سپاہی اکٹھے ہو گئے۔ یوں صدر کی خودنوشت ایک سنسنی خیز دستاویز کی شکل اختیار کر گئی۔

الطاف گوہر اور ہمایوں گوہر میں ایک بنیادی فرق تھا۔ الطاف گوہر ایک منجھے ہوئے بیوروکریٹ تھے۔ انہوں نے اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے سول سروس کا آغاز کیا تھا۔ چنانچہ وہ حکومتی، سفارتی اور ثقافتی رموز سے واقف تھے۔ ان کو چیزوں کے نتائج اور ردِّعمل کا اندازہ تھا۔ وہ صدر ایوب خان کے بھی بہت قریب تھے۔ لہٰذا الطاف گوہر نے صدر ایوب خان کو بعض چیزیں حذف کرنے پر قائل کر لیا تھا۔ انہوں نے صدر ایوب کو ان چیزوں کے نتائج اور ردِّعمل سے بھی آگاہ کر دیا تھا جبکہ ہمایوں گوہر کسی بھی دور میں سرکاری ملازم نہیں رہے۔ لہٰذا وہ سرکاری اور سفارتی مجبوریوں سے واقف نہیں تھے۔ وہ صدر پرویز کے بہت زیادہ قریب بھی نہیں تھے۔ لہٰذا وہ انہیں خطرناک چیزیں حذف کرنے پر قائل نہ کر سکے۔ چنانچہ جب ۲۵ ستمبر ۲۰۰۶ء کو صدر کی کتاب **IN THE LINE OF FIRE** شائع ہوئی تو اس نے پاکستان کے امیج کو جڑوں سے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کتاب میں بے شمار ایسی باتیں ہیں جن سے نہ صرف صدر پرویز کا امیج خراب ہوا بلکہ پاکستان کا بین الاقوامی تاثر بھی بری طرح مجروح ہوا۔ مثلاً: اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں صدر نے اپنے دو معاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ دو معاشقے صدر کے امیج کو بری طرح مجروح کر رہے ہیں۔ جس وقت صدر مشرف جوانی کے دور سے گزر رہے تھے تو وہ ایک کھلنڈرے نوجوان تھے لیکن جب یہ کتاب لکھی گئی تو وہ نہ صرف ایک مدبر اور سنجیدہ شخص تھے بلکہ وہ اسلامی دنیا کے پہلے ایٹمی اسلامی ملک کے صدر بھی تھے۔ ۵۰ء کی دہائی کے کھلنڈرے مشرف اور ۲۰۰۶ء کے مدبر مشرف میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر کتاب لکھنے والے اور لکھوانے والے دونوں ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۶ء کے صدر مشرف کو سامنے رکھ لیتے تو شاید صدر کے امیج میں اضافہ ہو جاتا۔ میں بات کو آگے بڑھانے سے پہلے صدر کی کتاب کے ابتدائی صفحات کی ایک تلخیص پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تلخیص صدر کے معاشقوں کے بارے میں ہے جو انتہائی سنسنی خیز اور خطرناک ہے۔ صدر صاحب لکھتے ہیں: انہوں نے اپنی پہلی محبت ایک پڑوسن سے کی اور دوسرا عشق ایک بنگالی لڑکی سے کیا۔ صدر صاحب لکھتے ہیں: جب وہ دسویں جماعت میں تھے تو انہیں پہلی بار اپنی پڑوسن سے محبت ہو گئی۔ صدر کا کہنا تھا وہ شرمیلے تھے لہٰذا لڑکیوں کو لبھانے کی بجائے خود ہی اس کے اسیر ہو گئے۔ وہ لڑکی انگریزی نہیں جانتی تھی جبکہ میری اردو اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ میرا دوست یہ خط پڑھ کر مجھے سناتا تھا۔ صدر لکھتے ہیں: وہ اپنی نانی سے پیغام رسانی کا کام لیتے رہے جس کا نانی کو علم نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے برقع پہنا ہوتا تھا تو وہ ان کی آنکھ بچا کر خط ان کے برقع کی جیب میں ڈال دیتے تھے۔ اسی طرح دوسری لڑکی کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں: یہ مشرقی پاکستان کی بنگالی لڑکی تھی اور بہت خوبصورت تھی۔

یہ واقعات پڑھنے کے بعد آپ خود فیصلہ کیجیے۔ آپ کے ذہن میں صدر مشرف کا کیا تاثر ابھرتا ہے۔ صدر مشرف نے کتاب میں اپنی بیگم صہبا مشرف کے ساتھ منگنی اور اس کے بعد کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ ان واقعات میں انہوں نے

تحریر کیا ہے کہ وہ بیگم صہبا مشرف سے شادی سے پہلے **Dates** لگاتے تھے اور وہ دونوں ڈسکو کلب بھی جاتے تھے۔اس کتاب میں صدر پرویز مشرف نے بھٹو کو پاکستانی حکمرانوں میں بدترین اور منافق شخصیت قرار دیا۔ان انکشافات کو اگر دیکھا جائے تو ان سے بھی ایک بہت اچھی شخصیت کا تاثر نہیں ابھرتا۔صدر نے اس کتاب میں کتوں کے ساتھ اپنی رغبت کا انکشاف بھی کیا۔ان کا کہنا تھا وہ اپنے گھر میں چھوٹے کتے پالا کرتے تھے اور انہیں کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔کتوں کے ساتھ اس محبت سے بھی صدر کا بہت اچھا امیج یا تاثر نہیں ابھرتا۔

یہ صدر کی ذاتی زندگی تھی۔اب ان کی سیاسی اور عسکری زندگی کی طرف آئیں تو اس میں بھی بعض ایسے مقام آجاتے ہیں جن سے صدر اور پاکستان دونوں کا امیج خراب ہوتا ہے۔مثلاً گیارہ ستمبر کو لیجیے۔گیارہ ستمبر کے بعد جب امریکہ نے پاکستان کو دھمکی دی تو اس وقت پاکستان کے پاس امریکہ کا ساتھ دینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔پاکستان' امریکہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ہم عسکری، معاشی اور معاشرتی طور پر کمزور تھے۔اس کے بعد وہ ڈاکٹر عبدالقدیر کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے ہی سے آزادی حاصل تھی اور وہ صرف صدر پاکستان کو جوابدہ تھے۔ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اس آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور وہ ۱۹۸۷ء میں ایٹمی معلومات کے تبادلے کے عمل میں مصروف ہوگئے۔

صدر لکھتے ہیں: ڈاکٹر قدیر خان نے لیبیا، شمالی کوریا، ایران اور بھارت سے ایٹمی معاہدے کیے اور انہوں نے قوم کو مشکل میں ڈال دیا جبکہ کارگل کے حوالے سے صدر لکھتے ہیں کارگل کی جنگ نے نواز شریف اور میرے درمیان خلیج کھڑی کردی۔جب نواز شریف بیرونی دباؤ پر زیرِ قبضہ علاقے خالی کرنے پر مجبور ہوئے تو وہ بکھر گئے۔اگر ہم ان تمام واقعات کا تجزیہ کریں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے اس کتاب میں صدر صاحب نے نہ صرف خود کو ایک کمزور شخصیت کے طور پر پیش کیا بلکہ انہوں نے پاکستان کو بھی ایک ایسا ملک ثابت کردیا جس کی اپنی کوئی ٹھوس پالیسی نہیں۔جس میں طاقت ور حکمرانوں کی زبان کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔

یہ کتاب ثابت کرتی ہے پاکستان کی نہ تو کوئی داخلہ پالیسی ہے اور نہ ہی کوئی خارجہ۔یہ کتاب ثابت کرتی ہے پاکستان اخلاقی طور پر بھی ایک انتہائی کمزور ملک ہے اور ہم لوگ اس حد تک مجبور اور کمزور لوگ ہیں کہ رچرڈ آرمیٹج کی ایک کال ہماری پچاس سالہ پالیسیوں کو یوٹرن لینے پر مجبور کردیتی ہے۔یہ کتاب ثابت کرتی ہے اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں اسلام محفوظ ہے اور نہ ہی ایمان۔یہ کتاب ثابت کرتی ہے پاکستان میں عوام کے نظریات اور خیالات اس ملک کی رولنگ ایلیٹ کلاس کے خیالات سے بالکل مختلف ہیں۔یہ کتاب ثابت کرتی ہے اس ملک کے حکمران پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا چاہتے ہیں جو امریکہ اور اس کے اتحادی ملکوں کے لیے قابل قبول ہو۔ہمارے حکمران پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا چاہتے ہیں جس میں عورتیں ''آزاد'' ہوں، جس میں ڈسکو کلب اور شراب عام ہو اور جس کے حکمرانوں میں وہ تمام شرعی عیب موجود ہوں جن کی اخلاقیات اجازت دیتی ہے اور نہ ہی مذہب۔یہ کتاب' کتاب نہیں بلکہ ہماری سفارتی اور سیاسی بداعمالیوں کا دستاویزی ثبوت ہے۔

(مطبوعہ: ہفت روزہ ''ضربِ مؤمن'' کراچی۔۶ تا ۱۲/اکتوبر ۲۰۰۶ء)

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

سوچیے مگر ''حدود'' کے اندر

حدود آرڈی نینس کے خلاف خوب دھول اڑانے کے بعد، جس میں ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل اور اخبار نے فنکارانہ چابک دستی سے لوگوں کو سوچنے کی دعوت دی اور مخصوص زاویئے سے تیار کردہ اپنے سوالات کی پچ پر علماء کرام کو بولڈ کرنے کی کوشش کی۔ اب حکومت پاکستان نے اس معاملے کو (اپنی دانست میں) ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا ہے اور حدود آرڈی نینس میں مجوزہ ترامیم کابل قومی اسمبلی میں پیش کر کے اسے منظور کروانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس ساری سرگرمی میں بعض باتیں واقعی بہت سوچنے کی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حدود آرڈی نینس کوئی ایشو نہیں تھا، نہ اب ہے۔ اگر ملک میں امن وامان کی حالت دگرگوں ہے یا خواتین کو مسائل درپیش ہیں تو اس کے متعدد اسباب ہیں۔ مثلاً پولیس کا رویہ، غیر مؤثر نظام انصاف، انتہائی غربت، مجرموں کو بروقت سزا نہ ملنا، کمزور معاشرتی ڈھانچہ.....وغیرہ۔ اگر اس میں ناقص قانونی ڈھانچے کا بھی کوئی کردار ہے تو پھر بھی اس میں سے حدود قوانین کو چھانٹ کر الگ کرنے اور نشانہ بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ چلئے بفرض محال اگر حدود قوانین میں کوئی خامی تھی تو پھر بھی اسے اتنا بڑا ایشو بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ حکومت اگر چاہتی تو پہلے سنجیدہ اور معتدل علماء کرام کو اکٹھا کرتی اور انہیں اعتماد میں لیتی پھر پرسکون ماحول میں مخالف سیاسی علماء سے بھی بات منوالینا اس کے لیے مشکل نہ ہوتا۔ سارے علماء کرام اس بات کو سمجھتے ہیں کہ حدود اللہ کے نفاذ کے لیے جو قانونی ڈھانچہ بنایا گیا ہے، وہ انسانی کاوش ہے اور اس میں تجربے اور مشکلات کی بنا پر کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ حدود آرڈی نینس کو ایشو بنایا اور میڈیا میں اس کے خلاف مہم چلوائی۔

اس کی وجہ بظاہر یہ سمجھ آتی ہے کہ اصل مسئلہ خواتین کے حقوق کا یا امن وامان کا نہیں بلکہ کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ مغرب نہیں چاہتا کہ کسی مسلم معاشرے میں اسلامی قوانین نافذ ہوں، خصوصاً وہ قوانین جو مغربی طرز زندگی سے متصادم ہیں۔ یہ ایک کھلا راز ہے کہ مغرب پہلے دن سے پاکستان میں نفاذِ شریعت اور قوانین اسلام کے نفاذ کی مخالفت کرتا رہا ہے۔ ان میں سے سرفہرست یہ ہے کہ وہ مسلم ممالک پر ایسے حکمران مسلط کرتا ہے جو اس کی حمایت سے برسراقتدار آتے ہیں اور اس کی سیاسی، مالی، تعلیمی، تہذیبی حمایت سے اس کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کا کام کرتے ہیں۔ ان میں این جی اوز سے لے کر میڈیا اور مولوی نما سکالرز وغیرہ سب شامل ہیں۔

چنانچہ پہلے مغربی شاطروں نے اپنے حمایت یافتہ میڈیا اور مسلم سکالرز میں سے اپنے آدمیوں کے ذریعے

حدود آرڈی نینس کے خلاف ایک بھرپور مہم چلوائی۔ اس قانون میں موجود اور غیر موجود خامیوں کو نمایاں کیا' اسے خلافِ عقل قرار دیا' اسے ظالمانہ ثابت کیا اور پھر ایک مخصوص فضا قائم کرنے کے بعد حکومت پاکستان کو اشارہ کیا کہ حدود قوانین ختم کر دیئے جائیں یا مزید غیر مؤثر بنا دیئے جائیں۔ سوال یہ ہے کہ جو ٹی وی چینل ایک ایک سیکنڈ کی قیمت وصول کرتے ہیں' وہ گھنٹوں حدود آرڈی نینس کے خلاف وقف رہے اور جو اخبار اپنا ایک ایک انچ فروخت کرتے ہیں' وہ صفحات کے صفحات اس کے لیے مختص کرتے رہے اور بعض دینی سکالرز اور ان کے ادارے ہمہ وقت اس وقت سارے تماشے کو منظّم کرنے میں لگے رہے۔ آخر کیوں؟ اور لوگ یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ ان اداروں نے اپنا وقت اور محنت کی قیمت کس سے وصول کی اور کتنی وصول کی۔

اس میں ایک بات علماء کرام کے سوچنے کی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے معاملات میں ان کا ردّ عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہماری رائے میں یہ علماء کرام کی سادہ لوحی ہے کہ وہ ان شاطر ٹی وی والوں کی بنائی ہوئی پچ پر کھیلتے رہے اور ان کے شاطرانہ چابک دستی سے تراشے گئے سوالات کے دائرے میں گھومتے رہے۔ ایسے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے ان کی پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ انہیں اس موضوع پر آزادانہ اظہار رائے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ مذکورہ مسئلے پر اپنے زاویہ نگاہ سے روشنی ڈال سکیں نہ کہ ٹی وی والوں کے عیارانہ سوالات کے چکر میں پھنسے رہیں۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ حدود قوانین کے حوالے سے ٹی وی والوں نے جو سوالات ابھارے' وہ جعلی اور خلط مبحث پیدا کرنے کے لیے گھڑے گئے تھے تاکہ حدود اللہ کی ہوا خیزی ہو اور علماء کی بھد اڑے ورنہ اس حوالے سے جو حقیقی سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں اور جو اس کے متقاضی ہیں کہ ہم ان پر سوچیں اور غور کریں' وہ یہ ہیں:

(۱) پاکستان میں حدود قوانین پر آج تک عمل کیوں نہیں ہوا؟ یہ قوانین ۱۹۷۹ء میں پاس ہوئے تھے لیکن آج تک کسی چور کا ہاتھ نہیں کٹا، کسی ڈاکو کا پاؤں نہیں کٹا اور کسی زانی کو رجم نہیں کیا گیا! آخر کیوں؟ سعودی عرب دنیا کا واحد ملک ہے جہاں حدود قوانین پر سنجیدگی سے عمل ہوتا ہے اور وہاں جرائم کی شرح ساری دنیا سے کم ہے۔ ہمارے ہاں بھی اگر ان پر عمل ہوتا تو جرائم کم ہو جاتے لیکن ہمارے ہاں ان پر عمل ہی نہیں ہوا۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں ماحول ٹھیک نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ماحول ٹھیک کرنا کس کا کام ہے؟ کیا یہ حکومت کی ذمہ داری نہیں؟

(۲) کیا ایک مسلم معاشرے میں فحاشی اور عریانی پھیلانا جرم ہے یا نہیں؟ کیا پاکستان میں عریانی اور فحاشی پھیلانے کے خلاف قوانین موجود ہیں یا نہیں؟ پاکستان میں فحاشی اور عریانی کو رواج دینے میں ٹی وی اور اخبارات کا کردار (خصوصاً اس ٹی وی اور اس اخبار کا جس نے حدود کے خلاف مہم چلائی) کیا رہا ہے اور کیا ہے؟ اور ان کے خلاف آج تک قانون حرکت میں کیوں نہیں آیا؟

(۳) صدرِ مملکت نے فرمایا کہ وہ حدود قوانین کو بدل کر انہیں اسلام کے عین مطابق بنانا چاہتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ کس اسلام کے؟ کیا ان کا اور ان کے پسندیدہ چند نام نہاد اسلامی سکالرز کا اسلام یا ۱۵ کروڑ پاکستانیوں کا اسلام؟ صدرِ گرامی قدر تو کھلم کھلا خواتین کے پردے کی مخالفت کرتے رہتے ہیں اور چوروں اور زانیوں کے خلاف نفاذ حدود کی مزاحمت یہ کہہ کر کرتے رہے ہیں کہ میں ساری قوم کو لنجا اور لنگڑا نہیں بنا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ ملک میں مغرب کے حمایتی ایک شخص یا چند اشخاص کے تصورِ اسلام پر عمل ہونا چاہیے یا پندرہ کروڑ عوام کے تصورِ اسلام پر؟

(۴) مغرب کو حق ہے کہ وہ اپنی زندگی جیسے چاہے جیئے اور اپنے لیے جو قانون چاہے بنائے لیکن اسے کیا حق ہے کہ وہ ہمارے اس حق میں مداخلت کرے کہ ہم جیسے چاہیں جیئیں اور اپنے لیے جو قانون چاہئیں بنائیں! کیا ہم مغرب کے غلام ہیں؟ آخر ہمارے حکمران اور سول سوسائٹی کے مغربی حمایت یافتہ ادارے (میڈیا، تجدد پسند اسلامی سکالرز، این جی اوز وغیرہ) کب تک مغرب کی کاسہ لیسی کرتے رہیں گے؟ اور مسلم عوام کی امنگوں کو تاراج کرتے رہیں گے؟

(۵) حکومتِ پاکستان نے آج تک ایسے اقدامات کیوں نہیں کیے جن سے امن وامان کی حالت بہتر ہو، صحیح تعلیم وتربیت سے معاشرے میں پاکیزہ اخلاقی ماحول پروان چڑھے، غربت کا خاتمہ ہو، تعلیم بڑھے اور قوم میں شائستگی آئے؟ کیا اس کے لیے ناگزیر نہیں کہ ثقافتی پالیسی میں یہود وہنود کی پیروی نہ کی جائے اور معاشیات، تعلیم، قانون اور دیگر شعبہ ہائے حیات میں مغرب کے راستے پر چلنے کی بجائے اسلام کے سنہری اصولوں اور اس کی تابندہ اقدار وروایات پر عمل کیا جائے؟

اگرچہ سوالات اور بھی ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حدود قوانین کے حوالے سے ہمیں سوچنے کی جو بار بار ترغیب دی گئی ہے تو فی الحال اگر ہم مندرجہ بالا پانچ سوالات پر ہی سوچنے اور غور کرنے کا فریضہ انجام دے لیں تو ان شاء اللہ اس سے بہت فائدہ ہوگا اور بہت سے حقائق ہمارے سامنے آئیں گے۔ (مطبوعہ: ''نوائے وقت'' ملتان۔ ۲۳/اگست ۲۰۰۶ء)

الغازی مشینری سٹور
ہمہ قسم چائنہ ڈیزل انجن، سپیئر پارٹس
تھوک و پرچون ارزاں نرخوں پر ہم سے طلب کریں
بلاک نمبر 9 کالج روڈ، ڈیرہ غازی خان 064-2462501

نثار احمد خان فتحی

پاکستان میں مغربی ثقافت وملحدانہ افکار کا نفوذ اور اس کے اسباب

جناب نثار احمد خان فتحی نے ''پاکستان میں مغربی ثقافت اور ملحدانہ افکار کا نفوذ اور اس کے اسباب'' کے نام سے پونے تین سو صفحات پر مشتمل کتاب لکھی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں پاکستان کے سب سے اہم مسئلہ کا ہمہ پہلو جائزہ لے کر پاکستان کی ملتِ اسلامیہ اور دردمند دینی طبقات کے لیے حالات کی بہتری کے لیے صحیح حکمت عملی بھی تجویز کی ہے۔ کتاب کا ''پیش لفظ'' حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ اور ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے لکھا ہے۔ مصنف نے ''میں نے یہ کتاب کیوں لکھی'' کے تحت ابتدائیہ لکھا ہے۔ یہ ابتدائیہ ایسا ہے، جو ہم سب کی غیرتِ ایمانی کو للکارنے کے لیے کافی ہے۔ (ادارہ)

مغرب کی درس گاہوں، تحقیقاتی اداروں اور علمی مرکزوں سے مسلسل ایک آواز ہم سے مخاطب ہے۔ مگر افسوس کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا، کسی کا خون جوش نہیں مارتا اور کسی کی غیرت نہیں جاگتی۔ یہ آواز کہتی ہے:

''اے مسلمانو! اے ہمارے غلامو! سنو! تمہارے اقبال کے دن گزر گئے، تمہارے علم کے کنویں سوکھ گئے اور تمہارے اقتدار کا سورج ڈوب گیا۔ اب تمہیں حکمرانی اور سلطانی سے کیا واسطہ، تمہارے بازو اب شل ہو گئے اور تمہاری تلواروں میں زنگ لگ چکا ہے۔ اب ہم تمہارے آقا ہیں اور تم سب ہمارے غلام ہو۔

دیکھو! ہم نے سر سے پاؤں تک کیسا تمہیں اپنی غلامی کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ہمارا لباس پہن کر اور ہماری زبان بول کر اور ہمارے طور طریقے اختیار کر کے تمہارے سر فخر سے بلند ہو جاتے ہیں۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے جب ہمارا قومی نشان اور مذہبی شعار ٹائی لگا کر اسکول جاتے ہیں تو اس لباس کو دیکھ کر کیسا تمہارا دل خوش ہوتا ہے۔ ہم بے وقوف نہیں تھے۔ ہم نے تمہارے ملک کو اس وقت آزاد کیا جب ہم تمہارے دل و دماغ کو اپنا غلام بنا چکے تھے۔ اب تم ہماری آنکھوں سے دیکھتے ہو، ہمارے کانوں سے سنتے ہو اور ہمارے دماغ سے سوچتے ہو، اب تمہارے وجود میں تمہارا اپنا کچھ نہیں۔

اب تم ہر شعبہ زندگی میں ہمارے محتاج ہو، تمہارے گھروں میں ہمارے طور طریقے ہیں، تمہارے دماغوں میں ہمارے افکار ہیں، تمہارے اسکولوں اور کالجوں میں ہمارا مرتب کیا ہوا نصاب ہے، تمہارے بازاروں میں ہمارا سامان ہے اور تمہاری جیبوں میں ہمارا سکہ ہے، تمہارے سکے کو ہم پہلے ہی مٹی کر چکے ہیں۔ تم ہمارے حکم سے کیسے سرتابی کر سکتے ہو، تم اربوں اور کھربوں روپے کے ہمارے قرض دار ہو، تمہاری معیشت ہمارے قبضے میں ہے، تمہاری منڈیاں ہمارے رحم و کرم پر ہیں اور تمہارے سارے تجارتی ادارے صبح اٹھتے ہیں، ہمارے سکے کو سلام کرتے ہیں۔

تمہیں اپنے جوانوں پر بڑا ناز تھا۔تم کہتے تھے ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی'' تو سنو! اس زرخیز زمین کو ہم نے ہیروئن بھرے سگریٹ، شہوت انگیز تصویریں، ہیجان خیز زنا کے مناظر سے لبریز فلمیں اور ہوس زر کا آب شور شامل کر کے بنجر کر دیا ہے۔

تمہیں اپنی افواج پر بھی بڑا گھمنڈ تھا۔اب جاؤ! اپنی فوج کے اسلحہ خانوں کو دیکھو اگر ہم ہاتھ روک لیں تو تمہارا سارا نظام درہم برہم ہو جائے، اب تم بغیر ہم سے اجازت لیے کسی پر فوج کشی نہیں کر سکتے۔ بوسنیا اور عراق کے حشر کو ہمیشہ یاد رکھنا۔جاؤ! اب عافیت اسی میں ہے کہ جو طرزِ حیات اور طرزِ حکومت ہم نے تمہیں سکھایا ہے' اس سے سرمو انحراف نہ کرنا، خبردار! ہماری غلامی سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا اور ہمیں امید بھی یہی ہے کہ تم برسوں تک ایسا نہ کر سکو گے۔کیونکہ جتنے اس کوشش کے محرکات ہو سکتے تھے یعنی ایمان کی پختگی، جوش، جہاد، بالغ نظری، غیرت دین وہ سب ہم نے تمہارے دانشوروں، مفکروں اور عالموں سے دنیا کی چند آسائشی چیزیں دے کر خرید لیے ہیں۔ہم نے تمہاری عورتوں کو ٹی وی کے ذریعہ بے حیائی کی ترغیب دے کر اور سنگھار و آرائش حسن کا بہترین سامان دے کر ان کی چادر اتر وادی ہے اور تمہارے مردوں کو فحش اور عریاں فلمیں دکھا کر ان کی مردانگی کی جڑ کاٹ دی ہے۔اب تمہارے یہاں کوئی خالد، کوئی طارق، کوئی صلاح الدین اور کوئی ٹیپو پیدا نہیں ہو سکتا۔

اور سنو! ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔تمہاری قوم کے کچھ احسان بھی ہم پر ہیں۔خاص طور پر تمہارے علماء کے۔ انہوں نے اپنی مسجدوں اور مدرسوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی تکفیر کر کے اور آپس میں لڑ لڑ کر ہماری تہذیب و افکار کے لیے راستہ صاف کیا۔تمہارے دانشوروں اور مفکروں نے ترقی یافتہ اور ماڈرن کہلانے کے شوق میں ملحد اور زندیق بن کر ہمارے فلسفے کی اشاعت کی، تمہاری تعلیم گاہوں نے ہمارا نصاب تمہارے نوجوانوں کے دل و دماغ میں ہم سے بہتر طریقے سے اتار کر اپنے مذہب سے بغاوت پر اکسایا، تمہارے صاحبانِ اقتدار اپنے سارے وسائل تمہیں بے حیا، بے غیرت اور بے دین بنیاد پرست اور دہشت گرد بنانے کے لیے ہمارے ہی اشاروں پر استعمال کرتے آئے ہیں۔ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔تمہارے مذہب نے کیسی کیسی پابندیاں تم پر لگا رکھی تھیں۔یہ حرام وہ حرام، یہ جائز وہ ناجائز، زندگی کی راہیں تم پر تنگ کر دی تھیں، ہم نے تمہیں زندگی کا ایک نیا راستہ دکھایا اور تمہیں حرام حلال کی قید سے آزاد کر دیا۔کیا تم اس پر ہمارا شکریہ ادا نہ کرو گے، اے مسلمانو! اے ہمارے غلامو! کیا تم سنتے ہو؟''

یہ آواز دن رات مسلسل میرے کانوں میں آتی ہے اور اس کا ایک ایک لفظ تیر کی طرح میرے دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔میں حیرانی سے چاروں طرف دیکھتا ہوں کہ شاید کچھ اور لوگ بھی سن رہے ہوں مگر سب اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہیں اور کوئی توجہ نہیں دیتا۔میں نے سوچا' اس کتاب کے ذریعے ہی سب کو یہ آواز سنا دوں' شاید کسی کی غیرتِ ایمانی جاگ اٹھے اور اللہ پاک اس سے کوئی غیر معمولی کام لے لے۔**وما ذالک علی اللّٰہ بعزیز**

(مطبوعہ: ماہنامہ ''بیداری'' حیدرآباد)

ڈاکٹر امتیاز احمد عباسی
(اسلام آباد)

اللہ اللہ کرو دوستو

اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو
اس کے لاکھوں ہیں ہم پر کرم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

دور ہوتی اسی سے ہیں سب ظلمتیں
ہے اسی سے اُجالا بہم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

اللہ اللہ سے دل کو میسّر سکون
اللہ اللہ مٹاتا ہے غم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

جو بھی غافل ہوا پس وہ مردہ ہوا
ذکر سے دم میں آتا ہے دم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

پیدا ہوں ذکر سے سب حمیدہ صفات
ہوں رذائل کے سر بھی قلم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

قلبِ ذاکر پہ سارا جہاں منکشف
جامِ دل برتر از جامِ جم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

ان کے دربار میں قابلِ قدر ہے
ہو ندامت سے جو چشم ' نم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

نفس پر اک قدم خُلد میں دوسرا
ہے جنت تو بس دو قدم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

حبِّ مولا سے دل کو مزیّن کرو
حبِّ مولیٰ ہی دین اور دھرم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

عزتیں ساری عقبیٰ کی ہیں دائمی
باقی فانی ہیں جاہ و حشم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

رب کی جانب رجوع کا بہانہ ہیں سب
اہلِ باطل کے جور و ستم دوستو
اللہ اللہ کرودم بدم دوستو

ہیں راہ بر مصطفیٰ ' اور منزل خدا
سنگِ میل اُن کے نقشِ قدم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

غیر سے کٹ رہو اپنے رب سے جڑو
بس اسی سے ہے اپنا بھرم دوستو
اللہ اللہ کرو دم بدم دوستو

ایمانِ جرأت خیز دے، فکرِ جنوں انگیز دے
راکبانِ احمد مرسل کو پھر مہمیز دے
یا الٰہی! دور کردے' ہم سے یہ پرویزیاں
فکرِ مہاتیر دے اور جرأتِ شاویز دے
میجر (ر) محمد سعید اختر (ملتان)

پروفیسر خالد شبیر احمد

نعت رسولِ مقبول ﷺ

سب غوث ، سب ولی ، سبھی اقطاب آپ کے
ہیں آفتاب و کوکب و مہتاب آپ کے

سیرت کا حرف حرف ہے قندیلِ آگہی
کندہ ہیں لوحِ وقت پہ ابواب آپ کے

سلطانِ دہر ، نازِ جہاں ، فخرِ کائنات
جھومر ہیں کائنات کا القاب آپ کے

سب سے بڑا ہے معجزہ قرآن آپ کا
کچھ کم نہیں ہے معجزہ اصحاب آپ کے

ہیں آپ ایک گلشنِ توحید کی مثال
گل ہائے رنگ رنگ ہیں احباب آپ کے

ضوریز ہیں حضور کے جوہر صدف صدف
ساحل فروز ہیں دُوِ نایاب آپ کے

روزِ ازل سے میں ہوں حضور آپ کا غلام
ہیں نقش میرے دل پہ بھی آداب آپ کے

دل میں ہیں میرے آپ کی یادیں بسی ہوئیں
آنکھوں میں بس رہے ہیں مری' خواب آپ کے

خالدؔ نصیب ہے ہمیں معراجِ بندگی
عرشِ بریں میں مسجد و محراب آپ کے

حکیم احمد شجاع ساحر

عہدِ حاضر کی لڑکیوں سے کہو

عہدِ حاضر کی لڑکیوں سے کہو
تم سے پہلے بھی لڑکیاں تھیں بہت

غیرتِ مہر و رشکِ ماہِ منیر
دیس کی اپنے بیٹیاں تھیں بہت

عصمت و عفت و حیا و وفا
ان کے گھر کی یہ لونڈیاں تھیں بہت

باادب ، باہنر ، سلیقہ شعار
کیا کہوں ! ان میں خوبیاں تھیں بہت

سرزمینِ وطن کے گھر گھر میں
ایک کیا ! چاند بیبیاں تھیں بہت

اُن کی آغوش میں پلے وہ جواں
خون میں جن کے گرمیاں تھیں بہت

ہاں ! تمہاری نظر سے گر دیکھیں
اگلے وقتوں میں سختیاں تھیں بہت

تم کو آزادیاں میسر ہیں
پاؤں میں اُن کے بیڑیاں تھیں بہت

پر کبھی تم نے اس پہ غور کیا
گرچہ جاہل یہ بیبیاں تھیں بہت

تم سے آباد ایک گھر نہ ہوا
اُن سے آباد بستیاں تھیں بہت

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

بے پروا

سب کچھ اُس کی دین ہے بابا
یہ دنیا
اک رین ہے بابا
کوئی نہ ویسا رشتہ ناتا
سب سے اچھا مالک داتا
جس جا اُس کا نام بھی آوے
سکھ، سکون، آرام بھی پاوے
ہر مشکل میں کام بھی آوے
گاڑی، موٹر کاریں دے کر
پُتر کا وہ پیار نہ دیوے
دولت بے شمار وہ دے کر
اک دلِ بیدار نہ دیوے

پیدل چلتے شوگر والے
دیکھے اکثر ہُوٹر والے
جوتے دیوے
پاؤں نہ دیوے
پاؤں بھی دے کر
زخمی کر دے
کھانا پینا
سب کچھ دے کر
معدے میں
بدہضمی کر دے
اُس کی مرضی، اُس کی اچھیا!
جو کچھ مالک چاہے ہوگا

☆.....☆.....☆

مولانا حکیم محمود احمد ظفر (پہلی قسط)

سید عطاء المحسن بخاریؒ سے میرے تعلقات

حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری قدس سرہ سے احقر کے تعلقات ۱۹۶۷ء سے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں احقر نے اپنی کتاب ''سیدنا معاویہؓ شخصیت و کردار'' میں طبع کرائی۔ کسی طریقہ سے یہ کتاب حضرت مولانا سید عطاء المنعم بخاری قدس سرہ نے بھی حاصل کر کے پڑھی۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ میری کتاب دراصل مولانا مودودی کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' کے جواب میں تھی۔ اس کتاب کا مضمون پہلے ۱۹۶۵ء میں مودودی صاحب کے رسالہ ''ترجمان القرآن'' میں قسط وار ''خلافت سے ملوکیت تک'' کے عنوان سے چھپا جس کا جواب شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہ نے ''براۃ عثمانؓ'' کے عنوان سے دیا۔ اس مضمون میں انہوں نے ان تمام الزامات کی تردید کی جو مولانا مودودی نے اس خلیفہ راشد کی ذات پر لگائے۔ حضرت مولانا سید عطاء المنعم بخاری نور اللہ مرقدہ نے اس مضمون کو ''براۃ عثمانؓ'' کے عنوان سے کتابی شکل میں طبع کروا دیا۔ اس مضمون میں مولانا مودودی کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف اس زہریلے پراپیگنڈے کو ختم کیا جو انہوں نے اپنے مضمون میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی کے خلاف کیا تھا۔ مولانا مودودی نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہدف تنقید بنایا اور ان کی یہ تنقید تنقیص کا پہلو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔ مولانا مودودی اپنے اس مضمون میں ان لوگوں کے ایمان اور اسلام میں کیڑے نکالنا شروع کیے تھے جنہوں نے ساری دنیا کو اسلام و ایمان کی دولت عطا کی تھی۔ گویا کہ اس مضمون میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ

اہل گلشن کے لیے بھی باب گلشن بند ہے
اس قدر کم ظرف کوئی باغباں دیکھا نہیں

ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن کو مودودی صاحب نے اپنی تنقید کا ہدف بنایا، ایک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، جن پر میں نے تحقیقی کام کیا اور ایک ضخیم کتاب مرتب کی جس میں ان کی سیرت اور مودودی صاحب کے اعتراضات کے جوابات کتاب و سنت اور تاریخ کی روشنی میں دیے۔ حضرت مولانا سید عطاء المنعم رحمہ اللہ نے میری اس کتاب کو پڑھا اور اس کتاب کی تحسین و ستائش میں ایک خط احقر کو لکھا اور ساتھ ہی ''یومِ معاویہؓ'' پر ملتان آنے کی دعوت دی۔ میں عوامی جلسوں میں تقریر کرنے کا عادی نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہوں، اس لیے میں نے معذرت کر دی۔ کچھ روز بعد حضرت شاہ صاحبؒ اپنے تبلیغی سلسلہ میں سیالکوٹ تشریف لائے تو غریب خانہ پر حاضر ہوئے اور مجھے اصرار کیا کہ میں ضرور ''یومِ معاویہ'' پر ملتان حاضر ہوں۔ سید عطاء المنعم بخاریؒ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد تو پھر جب بھی وہ گوجرانوالہ یا سیالکوٹ تشریف لاتے، قریباً سارا دن میرے ہاں ہی گزارتے۔ کچھ اپنی کہتے کچھ میری سنتے۔ میری ہمت افزائی فرماتے مجھ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارہ میں مزید لکھنے کی تاکید فرماتے۔ ان کی وہ سب باتیں آج تک میرے کوزۂ ذہن میں محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں

کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے کیونکہ ع

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

میں حضرت شاہ صاحبؒ سے ملتان حاضر ہونے کا وعدہ تو کر بیٹھا، لیکن طبیعت جانے کے لیے آمادہ نہ ہوتی تھی کیونکہ میں اپنی بے بضاعتی کو بخوبی سمجھتا تھا، اور حضرت شاہ صاحبؒ کی صدارت میں تقریر کرنا بڑے حوصلہ کی بات تھی لیکن وہ حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔ وعدہ کو ایفا کرنا بھی ضروری تھا چنانچہ میں مقررہ تاریخ سے ایک روز قبل بذریعہ شاہین ایکسپریس ملتان پہنچا۔ شاہین ایکسپریس ویسے ہی رات کو ملتان پہنچتی تھی، لیکن اس روز حسب معمول دو تین گھنٹے لیٹ ہوگئی اور شاید رات کے دو بجے ملتان پہنچی۔ میرا خیال تھا کہ رات اتنی دیر مجھے ریلوے اسٹیشن پر لینے کے لیے کوئی نہیں آئے گا اور مجھے خود ہی تانگہ یا ٹیکسی کے ذریعہ کوٹ تغلق جانا ہوگا لیکن جونہی میں ریلوے اسٹیشن پر اترا، حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاریؒ کو اپنا منتظر پایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے معذرت کی کہ آپ کو میری وجہ سے اتنی رات تک تکلیف اٹھانا پڑی لیکن انہوں نے خندہ پیشانی سے فرمایا کہ یہ میرا فرض تھا۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ بہرحال وہ مجھے لے کر اپنے گھر آئے جو کوٹ تغلق میں واقع تھا۔ یہ حضرت سید عطاء المحسن بخاریؒ سے میری سب سے پہلی ملاقات تھی۔

دوسرے روز یوم معاویہؓ کا جلسہ تھا۔ احقر نے اس میں تقریر کی۔ میری تقریر کے دوران کچھ طالب علموں نے گڑبڑ کی جن کو وہاں کے ایک شیخ الحدیث نے صرف اسی مقصد کے لیے بھیجا تھا۔ جونہی ان طالب علموں نے گڑبڑ کی، اللہ کے یہ دو شیر سید عطاء المحسن بخاریؒ اور سید عطاء المؤمن بخاری ناموس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تحفظ کے لیے میدان میں کود پڑے اور چند لمحوں ہی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ان دشمنوں کو میدان سے بھگا دیا اور پھر جلسہ نہایت سکون و اطمینان سے ہوتا رہا۔ صبح میں ان شیخ الحدیث صاحب کے مدرسہ میں گیا اور ان سے افسوس کے ساتھ ان کے مدرسہ کے طالب علموں کی رات کی حرکت کا ذکر کیا تو انہوں نے جو جواب دیا، اس جواب نے ان کی شیخ الحدیثی کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا اور ان کی محبت صحابہ کا سارا بھرم جاتا رہا۔ اب وہ صاحب مرحوم ہو چکے ہیں اور سیدنا معاویہؓ کے بغض کا جواب وہ خود اپنے اللہ کو دیں گے، لہٰذا میں ان کا جواب یہاں نقل کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔

جلسہ کے بعد بھی تین چار روز ملتان میں رہا۔ محسن شاہ صاحبؒ مجھے کئی جگہوں پر لے کر گئے، کئی دوستوں سے ملایا۔ ان کے حسن و سلوک اور بلند اخلاق نے مجھ پر کچھ ایسا جادو کیا کہ پھر اس ملاقات نے دوستی کا روپ دھار لیا اور روز و شب کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دوستی کا یہ رشتہ روز بروز گاڑھا ہوتا گیا۔

پھر ۱۹۷۱ء میں بھی ایک دفعہ احقر حضرت مولانا عبدالرحمٰن اشرفی اور حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ جمعیت علمائے اسلام کے سلسلے میں ملتان گئے۔ رات کو عیدگاہ میں جلسہ تھا۔ اس دفعہ بھی اسی شیخ الحدیث صاحب نے اپنے طالب علموں کو جلسہ خراب کرنے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے خرابی کی کوشش بھی کی۔ کچھ خشت باری بھی ہوئی لیکن بخاری برادران نے ان کو مار بھگایا اور حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ نے نہایت اطمینان کے ساتھ لوگوں کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری نور اللہ مرقدہ سے میرے تعلقات استوار ہوتے

گئے۔شاہ صاحبؒ جب بھی سیالکوٹ اپنے جماعتی کاموں کے لیے تشریف لاتے تو احقر کے غریب خانہ یا فیکٹری میں ضرور تشریف لاتے۔مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے۔یادوں کی برات کے ہدیے بکھیرتے۔بزرگوں کی باتیں سناتے جن سے انہیں انتہائی عشق تھا۔ان لوگوں کے لتّے لیتے جو اکابر سے تعلقات کا دعویٰ کرتے ہوئے ان کے مسلک سے اعراض برتتے۔دوران گفتگو جب صحابہ کرام ﷺ کا تذکرہ ہوتا تو حضرت شاہ صاحب کی آنکھیں نمناک ہوجاتیں۔آپ کے جسم کے روئیں روئیں سے صحابہ کرام ﷺ کی محبت کے چشمے ابلتے تھے۔اپنے والد محترم حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کی طرح ''نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو'' کا مظاہر ہوتا۔

ایک دفعہ ایک سلسلۂ گفتگو میں مجھے فرمایا: ''حکیم صاحب! اس وقت دنیا میں دو قسم کی جماعتیں ہیں۔ایک وہ جماعت جس میں کوئی نظم وضبط ہے اور دوسری وہ جو ہر قسم کے نظم وضبط سے عاری ہے۔پہلی کا نام ''جماعت'' ہے اور دوسری کا نام ''بھیڑ''۔''بھیڑ'' بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں ملتی ہے کہ ہر شخص منہ اٹھائے چلا جارہا ہے۔اور ''جماعت'' مسجدوں میں دیکھی جاسکتی ہے جب ہزاروں انسانوں کی منظّم ومرتب صفیں ایک مقصد، ایک حالت اور جہت اور ایک شخص (امام) کے پیچھے اکٹھی ہوتی ہیں۔اس کی ایک آواز پر لبیک کہتی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اظہار کرتے ہوئے کبھی رکوع اور کبھی سجود میں چلی جاتی ہیں۔''بھیڑ'' افراد کی مرضی کے تحت چلتی ہے اور جماعت ایک امیر کی زیرنگرانی نظم وترتیب کے ساتھ اپنا کردار ادار کرتی ہے۔افراد کا وجود قرآن کے نزدیک کڑیوں کا ہے اور اجتماع کا وجود زنجیر کا حکم رکھتا ہے۔ہر وجود ایک کڑی ہے۔اس کا کام اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی، زنجیر مضبوط نہ ہوگی۔اس لیے جماعتی زندگی ہی اصل زندگی ہے، فرد کی زندگی کی کتاب وسنت کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں۔یہی وجہ ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکا یک برباد نہیں کردیتے۔افراد کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم ہلاکت کا ایک ایسا تخم ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کو تھوڑے ہی عرصہ میں تباہ وبرباد کرکے رکھ دیتا ہے۔اس لیے ہر شخص کو جماعتی زندگی گزارنی چاہیے اور دوسرے ان جماعتوں کا ساتھ دینا چاہیے جو کسی صاحب علم وعمل کی قیادت میں چل رہی ہوں۔اگر یہ جماعتیں نظم وضبط نہیں تو پھر افراد کا یہ گروہ جماعت نہیں بلکہ ایک بھیڑ ہے۔یہ نہ قوم ہے، نہ امت ہے اور نہ ہی کوئی ملت صرف کنکر ہیں، مگر پہاڑ نہیں، اینٹیں ہیں مگر دیوار نہیں کڑیاں ہیں جو ٹکڑے ٹکڑے کردی جاسکتی ہیں، مگر زنجیر نہیں جو بڑے بڑے جابروں اور ظالموں کو پابجولاں کرسکتی ہے۔

حضرت شاہ صاحب نوراللہ مرقدہ جب بھی کبھی سیالکوٹ تشریف لاتے تو مجھ سے گھنٹوں اس قسم کی باتیں کرتے۔جب وہ اس قسم کی باتیں کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے دل میں ایک آگ ہے جس کے شعلے باہر نکلنا چاہتے ہیں، ایک آتش فشاں ہے جو پھٹنا چاہتا ہے۔ان کے دل میں ایک درد تھا، ایک سوز تھا جس کا وہ ہر وقت دوسروں سے اظہار کرتے رہتے۔

محسن شاہ صاحب کی زندگی جس نہج پر استوار تھی اس میں مذہب وادب کا رومانی امتزاج تھا۔ان کی مذہبی زندگی ایک کھلی کتاب تھی، جس کا ہر باب محبتِ صحابہ کرام ﷺ سے شروع ہوتا۔وہ اسی محبت کے سہارے جیتے تھے اور اسی پر انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔وہ گردوپیش سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا معاویہ ﷺ کے بارے

میں ایک شخص نے کہا کہ ہمارے اکابر میں سے فلاں نے اس کے خلاف لکھا ہے۔ اس کا فوری جواب شاہ صاحبؒ نے یہ دیا کہ جس کی بات میں کر رہا ہوں وہ ان اکابر کے بھی اکابر تھے۔ مختصر یہ کہ جب کسی مجلس میں بیٹھتے، لوگ ان کے انوارِ سخن سے جھولیاں بھرتے اور بعض ان کی باتوں کی یادداشتوں کو اپنے کوزۂ ذہن میں محفوظ رکھتے۔

سید عطاء المحسن بخاریؒ کا تعلق دیوبند کے مکتبہ فکر سے تھا۔ وہ فاضل دیوبند نہیں تھے لیکن ان کی ذہنیت میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی تعلیمات بھری ہوئی تھیں۔ بات بات میں ان بزرگوں کا حوالہ دیتے، لیکن عام قسم کے مولویوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کیونکہ ان کی آنکھوں نے جن علماء کو دیکھا تھا اور ان کے کانوں نے جن کی باتیں قرآن وسنت کی روشنی میں سنی تھیں، ان کے مقابلہ میں عام مولویوں کی باتوں کو وہ کوئی اہمیت نہ دیتے۔

ان کے ابا مرحوم نے ساری زندگی سیاست میں گزاری، لیکن پاکستان بننے کے بعد شاہ جیؒ نے سیاست چھوڑ دی تھی، اور اپنی ساری زندگی ختم نبوت کے لیے وقف کر دی۔ آپ کی اولاد نے بھی پوری زندگی سرکار دو عالم ﷺ کی ختم نبوت کے تحفظ کے لیے گزاری دی۔ ہر محاذ پر مرزائیت کا تعاقب کیا۔ انگریزوں کے خود کاشتہ پودا کو ہر موڑ پر بے نقاب کیا۔ ان کی تبلیغی طاقت کو ہر موقع پر زائل کیا اور بلا خوف وخطر مرزا غلام احمد کی ذریت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ چنانچہ زندگی کے آخری سالوں میں ''نقیب ختم نبوت'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا، جس کا مقصد وحید انگریزوں کی اس معنوی اولاد کو ہر محاذ پر بے نقاب کر کے مسلمانوں کو ان کے اصل چہرہ سے روشناس کرانا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک دو مرتبہ انگلستان کا سفر بھی کیا اور وہاں بھی مرزا طاہر کی کھلّم کھلا مخالفت کی اور مسلمانوں کو ان کے مہلک جراثیم سے بچانے کی پوری پوری کوشش کی۔ انگلستان کے دورے سے واپس آئے تو میں نے پوچھا: ''شاہ جی! انگلستان کیسا ہے؟'' فرمایا: ''لعنت پر پدر فرنگ و بر ذریت فرنگ''، بس اسی ایک جملہ میں فرنگیوں اور اس کی ذریت کی حقیقت کھول دی۔

کچھ مرزائیت کے بارے میں:

مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۸۸۰ء میں اپنے ملہم من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا (ریویو آف ریلیجز، بابت مئی ۱۹۰۶ء، نمبر ۵ جلد ۵ ص ۱۶۴)۔ اسی سال مرزا نے براہینِ احمدیہ لکھی۔ ۱۸۹۱ء میں اپنے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ ۱۹۰۴ء میں مثیل کرشن ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور پھر ۱۹۰۸ء میں مرزا کا لاہور برانڈرتھ روڈ میں انتقال ہو گیا۔ اسی اثناء میں (۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۸ء تک) مرزا نے بہت سی دولت اکٹھی کی جس کی مختصر تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

مرزا غلام احمد اگرچہ اپنے آپ کو اور اپنے والد مرزا غلام مرتضیٰ کو ''رئیس قادیان'' لکھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کا باپ ایک نہایت مفلسانہ اور قلاشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ باپ کی اس قدر قلاشی کی زندگی نے مرزا صاحب پر بڑا اثر کیا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ایک مالدار آدمی بنے گا۔ سیالکوٹ کی نوکری میں تو اسے صرف پندرہ روپے ماہوار (آٹھ آنے روزانہ) تنخواہ ملتی تھی۔ اتنی قلیل آمدنی میں تو اس کی معاشی زندگی درست نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور مختلف مذاہب پر کچھ نوٹس (Notes) جمع کیے۔ اسی دوران اس نے ایک اشتہار دیا کہ

میں اسلام کی حقانیت پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں جس میں تین سو دلائل دیے جائیں گے۔ طباعت کے لیے میرے پاس کوئی رقم نہیں لہذا کتاب کی قیمت پیشگی روانہ کردی جائے اور اس سلسلہ میں کچھ ویسے بھی مالی اعانت کی جائے کیونکہ کتاب پچاس جلدوں پر مشتمل ہوگی اور ایسی ضخیم کتاب کے مصارف ہزار ہا روپے ہوسکتے ہیں۔ (اشتہار مندرجہ براہین احمدیہ حصہ دوم)

لوگوں میں جوش پیدا کرنے کے لیے اشتہار میں یہ بھی لکھا گیا:

''واضح رہے کہ اب یہ کام صرف ان لوگوں کی ہمت سے انجام پذیر نہیں ہوسکتا کہ جو مجرد خریدار ہونے کی وجہ سے ایک عارضی جوش رکھتے ہیں بلکہ اس وقت کئی ایک ایسے عالی ہمتوں کی توجہات کی ضرورت ہے کہ جن کے دلوں میں ایمانی غیور کے باعث' حقیقی جوش ہے' اور جن کے بے بہا ایمان خرید وفروخت کے تنگ ظرف میں سما نہیں سکتا، بلکہ اپنے مالوں کے عوض میں بہشت جاوداں خریدنا چاہتے ہیں''۔ (اشتہار مندرجہ براہین احمدیہ حصہ سوم ابتداء)

ملکی حالات کچھ ایسے ہی تھے۔ لوگوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر مرزا صاحب کی کتاب کا طباعت کے لیے مالی امداد کی۔ کئی لوگوں نے پانچ ہزار، کئی لوگوں نے پانچ سو تک رقم یک مشت دی چنانچہ کئی ہزار روپیہ اکٹھا ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ لاکھوں میں ہو، لیکن چونکہ مرزا صاحب نے کوئی حساب نہیں دیا، لہٰذا کچھ کہا نہیں سکتا۔ اس کتاب کے بارہ میں مرزا صاحب نے بعض علماء کو بھی علمی مدد حاصل کرنے کے لیے خطوط لکھے، اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے اس بارہ میں کچھ علمی مواد بھی مرزا صاحب کو فراہم کیا۔ مرزا بشیر احمد ایم اے کے مطابق ''گو براہین احمدیہ کی تالیف اور اس کے متعلق مواد جمع کرنے کا کام پہلے سے ہو رہا تھا، مگر براہین احمدیہ کی اصل تصنیف اور اس کی اشاعت کی تجویز ۱۸۷۹ء سے شروع ہوئی اور آخری حصہ چہارم ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ (سیرۃ المہدی حصہ ا ص ۸۶)۔ کتاب کا نام رکھا گیا ''ابراہین الاحمدیہ علیٰ حقیقۃ القرآن والنبوۃ المحمدیہ''، لیکن یہ کتاب عام طور پر اپنے مختصر نام ''براہینِ احمدیہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

کتاب کی تالیف نے لوگوں کو ہر لحاظ سے مایوس کیا۔ کتاب کا اصل متن تو بہت کم تھا، لیکن حاشیہ اور حاشیہ در حاشیہ اس سے کئی گنا زیادہ۔ یہ چار حصے چھپ گئے، لیکن حصہ پنجم کے چھپنے میں تیئس سال تک التواء رہا۔ اس التو کی توجیہ بھی عجیب وغریب بیان کی گئی (ملاحظ ہو دیباچہ براہینِ احمدیہ حصہ پنجم ص ۶) اعلان میں کہا گیا تھا کہ کتاب براہینِ احمدیہ پچاس حصوں پر مشتمل ہوگی' لیکن چار حصوں کے بعد مکمل خاموشی نے لوگوں کے دلوں میں کئی شکوک وشبہات کو جنم دیا' اور لوگوں نے قیمت واپس لینے کے خطوط لکھے کیونکہ رقم پچاس حصوں کی لی گئی تھی۔ آخر ۲۳ سال کے طویل عرصہ کے بعد مرزا صاحب نے اس کا پانچواں حصہ طبع کیا اور اسکے دیباچہ میں لکھا:

''پہلے پچاس حصے لکھنے کا ارادہ تھا، مگر پچاس سے پانچ پر اکتفا کیا گیا اور چونکہ پچاس اور پانچ کے عدد میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے، اس لیے پانچ حصوں سے وہ وعدہ پورا ہوگیا''۔ (دیباچہ براہینِ احمدیہ حصہ پنجم ص ۷)

براہین احمدیہ کی طباعت سے مرزا صاحب کو مالی طور پر بہت فائدہ ہوا۔ اس مالی فائدہ کے پیش نظر اب انہوں نے اپنی دوسری کتابوں کی خرید وفروخت کے لیے بھی اشتہار جاری کرنے شروع کردیے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اپنی کتاب ''ازالۂ اوہام'' کا بھی اشتہار دے دیا (ملاحظہ ہو اشتہار۔ مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ تبلیغ رسالت جلد

۲ص۳۷)اسی قسم کے اشتہار انہوں نے اپنی کتابوں ''فتح الاسلام'' اور ''توضیح مرام'' کے بھی دیے۔ گویا مرزا صاحب اب پورے کتب فروش ہوکر اور اپنی کتابوں کے اشتہار دے کر لوگوں سے روپیہ بٹورنے لگے۔

محکمہ انکم ٹیکس کا نوٹس اور مرزا صاحب کا غلط بیان حلفی:

۱۸۹۲ء میں محکمہ انکم ٹیکس کو پتا چلا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی آمدن انکم ٹیکس کے قابل ہوگئی ہے تو انہوں نے مرزا صاحب کو ایک نوٹس بھیجا۔ نوٹس پڑھ کر مرزا صاحب پریشان ہوگئے۔ انہوں نے مسٹر ڈیکسن ڈپٹی کمشنر ضلع گورداسپور کے ہاں عذرداری داخل کردی انہوں نے منشی تاج الدین تحصیل دار پرگنہ بٹالہ ضلع گورداسپور کو انکوائری کے لیے بھیجا۔ مرزا صاحب نے تحصیل دار مذکورہ کے سامنے ایک بیان حلفی داخل کیا جس میں اپنی جائداد اور مریدین کی تفصیل پیش کرنا پڑی اب اس مدعیٔ نبوت اور مال کے پجاری کے بیان حلفی کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔ تحصیل دار کی وہ رپورٹ اپنی کتاب میں بقلم خود نقل کی ہے:

(۱) اس فرقہ (فرقۂ مرزائیہ) میں حسب فہرست منسلکہ ہذا ۳۱۸۱ آدمی ہیں۔ (یہ رپورٹ ۱۸۹۸ء کی ہے جب کہ اس سے قبل مرزا صاحب اپنے ہاتھوں سے اپنی کتاب میں اپنے جان نثار و مریدین کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ بتا چکے تھے۔ ملاحظ ہو ضمیمہ انجام آتھم ص ۲۶، روحانی خزائن جلد ۱۱ ص ۳۱) اب دونوں میں ایک تعداد غلط ہے۔

(ضرورۃ الامام ص ۴۲۔۴۳)

(۲) بیان حلفی میں دوسری بات یہ لکھوائی کہ اس کو تعلقہ داری زمین و باغ کی آمدنی ہے۔ تعلقہ داری کی سالانہ آمدنی تخمیناً ۸۲/۱۰ ہے۔ زمین کی تخمیناً ۳۰۰ روپے سالانہ، باغ کی آمدنی ۲۰۰ روپے، ۴۰۰ روپے اور ۵۰۰ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو کسی قسم کی اور آمدنی نہیں۔ مرزا غلام احمد نے یہ بھی بیان کیا کہ اس کو تخمیناً پانچ ہزار دوسو روپیہ مریدوں سے اس سال پہنچا ہے، ورنہ اوسط سالانہ آمدنی قریباً چار ہزار روپے ہوتی ہے اور وہ پانچ مدّوں میں خرچ ہوتی ہے (مہمان خانہ، مسافر، یتیم و بیوہ، مدرسہ، سالانہ و دیگر جلسہ جات، خط و کتابت مذہبی) اور اس کے ذاتی خرچ میں نہیں آتی۔ (ملاحظہ ہو ضرورۃ الامام ص ۴۵، روحانی خزائن جلد سوم ص ۵۱۶)

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اس سے دو سال قبل یعنی ۱۸۹۶ء میں مرزا صاحب لکھ چکے ہیں کہ مندرجہ بالا پانچ مدات میں سے صرف لنگر خانہ کا خرچہ چھے ہزار روپیہ سالانہ ہے۔ دیگر مدات اس کے علاوہ ہیں۔ یہ بھی لکھا کہ مباہلہ کے روز سے آج تک ۱۵ ہزار روپے کے قریب فتوح غیب کا روپیہ آیا جو اس سلسلہ کے ربانی مصارف میں خرچ ہوا، جس کو شک ہو وہ ڈاک خانہ کی کتابوں کو دیکھ لے اور دوسرے ثبوت ہم سے لے لے، اور رجوع خلائق کا اس قدر مجمع بڑھ گیا کہ بجائے اس کے کہ ہمارے لنگر میں ساٹھ، ستّر روپے ماہوار کا خرچہ ہوتا، اب اوسط خرچہ کبھی پانسو اور کبھی چھ سو ماہوار تک ہوتا ہے۔

(ضمیمہ انجام آتھم، ص ۲۸۔ روحانی خزائن، جلد ۱۱، ص ۳۱۲)

اب دونوں آمدنیوں کا موازنہ کرلیں اور دیکھ لیں کہ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے مرزا صاحب نے کتنا غلط اور جھوٹ پر مبنی بیان حلفی دیا۔ علاوہ ازیں مرزا صاحب نے ٹیکس سے بچنے کے لیے ایک فراڈ اور کیا کہ ۲۷ جون ۱۸۹۸ء کو ایک رجسٹری کے ذریعہ اپنی تمام زمین اور اپنی دوسری بیوی نصرت جہاں کے پاس رہن (گروی) رکھ کر چار ہزار روپے کا زیور اور

ایک ہزار نقد وصول پالیا، اور میعاد رہن تیس سال رکھی اور صاف لفظوں میں لکھا:

''مرزا صاحب کے اپنے بیان کے مطابق حال ہی میں اس نے اپنا باغ اپنی زوجہ کے پاس گروی رکھ کر اس سے چار ہزار روپے کا زیور اور ایک ہزار نقد وصول پایا ہے''۔ تو جس شخص کی عورت اس قدر روپیہ دے سکتی ہو اس کی نسبت گمان گزرتا ہے کہ وہ مالدار ہوگا''۔ (ضرورۃ الامام ص ۴۶، روحانی خزائن جلد ۱۳ ص ۵۱۷)

ملاحظہ فرمایئے کہ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے مرزا صاحب نے جھوٹا بیان حلفی پیش کر کے اپنے آپ کو کس قدر قلیل آمدنی والا ثابت کیا۔ اور پھر اپنی پہلی زوجۂ مطلقہ (بھجے دی ماں) کے حق مہر سے بچنے کے لیے اپنی تمام جائداد زوجۂ ثانیہ نصرت جہاں کے نام فرضی رہن رکھ دی، بیان حلفی میں یہ لکھ کر دیا کہ مریدوں کی آمدن اس کے ذاتی اخراجات میں صرف نہیں ہوتی۔ لیکن کثیر العیال والا اولاد ہونے کے ساتھ ساتھ رئیسانہ اور ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزارنا، کئی کئی ملازم، ملازمہ اور نوکر چاکر رکھنا، سلس البول (بار بار پیشاب آنا) اور دیگر بیماریوں میں دائمی طور پر مبتلا ہونا، یہ سب اخراجات اور مصارف کہاں سے پورے ہوتے تھے؟

مرزا غلام احمد نے مرزا بشیر الدین کی والدہ (یعنی اپنی دوسری بیوی) نصرت جہاں سے ۵۵ سال کی عمر میں شادی کی تھی۔ اس وقت نصرت جہاں کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ مرزا صاحب خود لکھتے ہیں کہ میں اس زمانہ میں بالکل نامرد تھا۔ چنانچہ کئی لوگوں نے ان کو اس شادی سے منع بھی کیا جن میں ایک مولوی محمد حسین بٹالوی بھی تھے، لیکن مرزا صاحب نے پھر بھی شادی کر لی اب انہیں مشک وعنبر سے تیار کردہ یاقوتیوں اور لبوب کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ آئے روز لاہور سے مشک وعنبر جو کہ اس زمانہ میں بھی نہایت قیمتی مفردات شمار ہوتے تھے، منگواتے رہتے تھے۔ مرزا صاحب کے ایک مرید نے ایک چھوٹا سا رسالہ ''خطوط امام بنام غلام'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ ان خطوط کو پڑھیئے جن سے پتا چلتا ہے کہ دو دو تولہ کستوری انہوں نے منگوائی ہے۔ مفرح عنبری جو کہ ایک گراں قیمت مرکب ہے، وہ بھی اکثر استعمال کرتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے لیے دو سو ساٹھ روپے کا خیمہ منگوایا کیونکہ وحی الٰہی (بقول ان کے) کی بنا پر رہائشی مکان خطرناک ہو گیا تھا۔ ان سب چیزوں کو ذہن میں رکھ کر ایک تو ان کے انکم ٹیکس والے بیان حلفی کو ملاحظہ فرمائیں، اور دوسرے یہ دیکھیں کہ سیالکوٹ کچہری میں ۱۵ روپے ماہوار پر چار سال کام کرنے والا مرزا غلام احمد اپنی تصنیف وتالیف اور نبوت اور مسیحیت کے کاروبار میں اب کس قدر مالدار اور امیر ہو گیا تھا۔ لوگوں کو سادگی کا سبق دیتا جب کہ خود اپنے گھر کے اندر عیش وعشرت اور ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزارتا۔ اسی پر خواجہ کمال الدین اکثر معترض رہتے تھے۔

مختصر یہ کہ نبوت کا یہ تدریجی دعویٰ مرزا صاحب نے صرف اور صرف دنیا کی دولت اکٹھی کرنے کے لیے کیا تھا، ورنہ وہ خود بھی سمجھتے تھے کہ نہ وہ مجدد ہیں، نہ محدث اور نہ مسیح ورسول۔ ان دعوؤں کے ذریعہ سے انہوں نے دولتِ دنیا اکٹھی کی، یہاں تک کہ آپ کے بعد آپ کے ایک لڑکے نے ۱۹۲۰ء میں ڈیڑھ لاکھ روپے کی جائداد برائے بیع نامہ مورخہ ۲۱ جون ۱۹۲۰ء رجسٹری شدہ ۵ جولائی ۱۹۲۰ء از مرزا اکرم بیگ ولد مرزا افضل بیگ وخاتون سردار بیگم بیوہ مرزا افضل بیگ ساکنان قادیان تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور سے خرید کی۔ خود مرزا صاحب نے اپنی کتاب حقیقۃ الوحی ص ۲۱۱ میں لکھا ہے کہ مجھے اب تک تین لاکھ کے قریب روپیہ آچکا ہے اور سال ہا سال سے ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار تک خرچ ہو جاتا ہے۔ یہ تین لاکھ آج کل کے تین کروڑ کے برابر ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کیونکہ جب مرزا صاحب کی تعلقہ داری کا سالانہ آمدنی صرف ۸۲ روپے ہوتی ہے

اوراس کے وسیع وعریض مکان کا کرایہ دوروپے ماہوار ہے تو اس سے اس تین لاکھ روپے کی آج کل کی قیمت کا اندازہ لگالیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ حقیقۃ الوحی کے ص ۲۱۱ پر تو مرزا صاحب نے لکھ دیا کہ ''مجھے اب تک تین لاکھ کے قریب روپیہ آچکا ہے''۔ لیکن چند صفحات آگے یعنی صفحہ ۲۴۲ پر لکھا کہ ''اس وقت سے آج تک دولاکھ سے بھی زائد روپیہ آیا ہے، اور اس قدر ہر ایک طرف سے تحائف آئے ہیں کہ اگر وہ سب جمع کیے جاتے تو کئی کوٹھے ان سے بھر جاتے''۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۴۰ پر لکھا کہ ''اب میرے سلسلہ کی تمام شاخوں سے قریباً تین ہزار روپے ماہواری آمدنی ہے''۔

کس کا یقین کیجئے اور کس کا یقین نہ کیجئے
لائے ہیں بزم یار سے دونوں خبر الگ الگ

غرضیکہ مرزا صاحب کا یہ سارا ڈھونگ کسب مال کے لیے تھا وگرنہ مسیحت اور نبوت کا دعویٰ اس کے بارہ میں انہیں خود بھی پتا تھا کہ وہ اس میں سراسر جھوٹے ہیں۔ پھر جو شخص صرف دنیا کی دولت کے لیے غلط اور جھوٹا بیان حلفی دیتا ہے، دین کے بارہ میں اس پر کیا اعتبار کیا جاسکتا ہے؟

نبوت کا دعویٰ تو انہوں نے صرف انگریزوں سے پیسہ بٹورنے کے لیے کیا تھا۔ اسی وجہ سے مرزا صاحب نے خود لکھا ہے:

''ہمارا جان نثار خاندان سرکار دولت مدار کا خود کاشتہ پودا ہے۔ ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون بہانے اور جان دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔'' (انگریزوں کی راہ میں خون بہانا ضروری اور اللہ کی راہ میں خون بہانا حرام۔ ایں چہ بوالعجبی است۔ ظفر)

مسیح موعود فرماتے ہیں:

''میں مہدی معہود ہوں اور برطانوی حکومت میری تلوار۔ پھر ہم احمدیوں کو فتح بغداد سے کیوں خوشی نہ ہو۔ عراق، عرب ہو یا شام، ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔''

(اخبار الفضل۔ جلد ۶، نمبر ۴۲۔ مورخہ ۷ر دسمبر ۱۹۱۸ء)

ایمان اور کفر کا معاملہ چونکہ نبوت کے اقرار وانکار پر مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے مرزا غلام احمد کی نبوت کا انکار کیا، ان کو کافر کہا گیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا محمود احمد نے لکھا:

''ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں، ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیونکہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں۔'' (انوار خلافت۔ ص ۹۰)

مرزا کے دوسرے بیٹے مرزا بشیر احمد نے لکھا ہے:

''حضرت مسیح موعود نے غیر احمدیوں (یعنی مسلمانوں) کے ساتھ صرف وہی سلوک جائز رکھا ہے جو نبی کریم نے عیسائیوں کے ساتھ رکھا۔ غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ کی گئیں، ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا؟ جو ہم ان کے ساتھ مل کر کرسکتے ہیں۔ دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ دینی اور دنیوی۔ دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے اور دنیوی تعلق

کا بھاری ذریعہ رشتہ وناطہ ہے۔سو یہ دونوں ہمارے لیے حرام قرار دیئے گئے۔اگر کہو کہ ہم کو ان کی لڑکیاں لینے کی اجازت ہے تو میں کہتا ہوں کہ نصاریٰ کی لڑکیاں لینے کی بھی اجازت ہے۔اور اگر یہ کہو کہ غیر احمدیوں کو سلام کیوں کہا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث سے ثابت ہے کہ بعض اوقات نبی کریم نے یہود تک کو سلام کا جواب دیا ہے۔'' (کلمۃ الفصل۔مندرجہ ریویو آف ریلیجنز۔ص ۶۹)

یہ تھی قادیانیت کی مختصر تاریخ۔قادیانیت کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی اس کو مذہب سے کوئی تعلق ہے۔ اس نے غیر ملکی شہنشاہیت کی خدمت گزاری کے لیے اور موجودہ سیاسی غلامی کے حق میں اس کو الہامی بنیاد فراہم کی۔علامہ اقبال نے سب سے پہلے اس کے خلاف قلم اٹھایا اور یہ بتایا:

''ختم نبوت ایک اجتماعی اور سیاسی لیکن مکمل اور ابدی تنظیم ہے جسے عرفاً اسلام کہتے ہیں۔محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس سے انکارِ کفر کو مستلزم ہو۔جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے' وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریک احمدیت کا بانی (مرزا غلام احمد قادیانی) ایسے ہی الہام کا مدعی تھا۔اس لیے وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔''.....''جب میں بانی احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ اس کی دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام ﷺ کے آخری نبی ہونے سے انکار کرتا ہے۔اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم المرسلینی پر متصرف ہو جاتا ہے۔''

''احمدیت اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوت ارادی کو فنا کر دیتی ہے جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔''

ان وجوہات کی بنا پر انہوں نے قادیانیوں کی مسلمانوں سے علیحدگی کا مطالبہ کیا۔علامہ اقبالؒ اس بارہ میں سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے قادیانیوں کے مسلمانوں سے الگ امت ہونے کا مطالبہ کیا۔ان کا کہنا تھا کہ اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدت الوہیت پر ایمان۔انبیاء پر ایمان اور رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت پر ایمان۔دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلمان اور نامسلمان کے مابین وجہ امتیاز ہے۔ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ وہ مسلمانوں سے الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔علامہ اقبالؒ نے مزید لکھا کہ ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔بانی تحریک مرزا غلام احمد نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ اور اپنے پیروؤں کو تازہ دودھ سے تشبیہہ دی ہے۔اس کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام، جمہور مسلمین سے اجتناب، ان کی نمازوں سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملوں میں مقاطعہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیائے اسلام کافر ہے۔مسلمانوں سے ان کی علیحدگی پر دال ہے۔لہٰذا میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کر لے۔یہ قادیانیوں کی پالیسی کے بھی عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لیں گے جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتے ہیں۔

جاری ہے

خالد ہمایوں

بت کدے میں اذان

عطاء المحسن شاہ جیؒ کو پہلی دفعہ میں نے مسجد حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (گجرات) میں دیکھا اور سنا۔ ماہ وسال کا تعین کرنے میں حافظہ ساتھ نہیں دے رہا۔ یہی کوئی تیس بتیس سال پہلے کی بات ہوگی۔ مسجد حیاۃ النبی ﷺ میں ان دنوں مولوی نذیر اللہ خان صاحب مرحوم ومغفور خطبۂ جمعہ دیتے تھے' وہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ کچھ عرصہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کی مسجد (فیصل گیٹ) میں ان کے نائب کے طور پر رہے پھر مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ پر ان سے اختلاف کیا اور نزدیک کے محلے کی ایک مسجد میں جا بیٹھے۔ محلے اور مسجد دونوں کا نام حیاۃ النبی ﷺ رکھ دیا۔ کچھ روز بحث مناظرے کا بھی بازار گرم رکھا' یہ ایک الگ داستان ہے 'مولانا وعظ خوب کرتے تھے' آواز کراری تھی' تقریر میں اکابر دیوبند کے قصوں کے پیوند لگاتے لطف دوبالا ہو جاتا۔ ایک دفعہ دورانِ تقریر فرمایا کہ امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کے فرزندِ ارجمند سید عطاء المحسن بخاری تشریف لائے ہیں' جمعہ کی نماز کے بعد خطاب کریں گے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ سوچا امیر شریعتؒ کو تو نہیں دیکھ سکے، ان کے صاحبزادے ہی کو سن لیتے ہیں، چنانچہ جمعہ کی نماز کے بعد کافی لوگ رک گئے۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ کے بعد قرآن مجید کی چند آیات تلاوت کیں تو دل روحانی انبساط سے بھر گیا، گھڑی گھڑی خیال آتا کہ اگر عطاء المحسن بخاری کا لحن اتنا دلپذیر ہے تو حضرت بخاریؒ کا کیا عالم ہوتا ہوگا؟ غالباً تقریر کا کوئی خاص موضوع متعین نہیں تھا۔ اتنا یاد ہے کہ انہوں نے مولانا نذیر احمد خان صاحب سے گزارش کی تھی کہ اختلافی مسائل نہیں چھیڑنے چاہئیں، یہ دیکھنا چاہیے کہ آج کی دنیا میں مسلمانوں کو کس طرح کے مسائل درپیش ہیں اور خود اسلام کی آج حالت کیا ہے؟ شاہ جی اپنی وضع قطع سے بھی بڑے مختلف معلوم ہوئے، انداز واطوار سے روایتی قسم کے مولوی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ قد دراز، جسم بھرا بھرا اور ٹھوڑی پر گنے چنے بال۔ بہرحال ذہن پر اپنی شخصیت کا ایک بھلا سا نقش بٹھا گئے۔

دوسری بار بھی انہیں اسی مسجد میں دیکھا، لیکن اب کے وہ سامعین سے مخاطب نہیں ہوئے۔ تیسری بار وہ ۱۹۷۰ء کے ہنگامہ خیز دنوں میں گجرات تشریف لائے اور چوک نواب صاحب میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کی۔ یہ تقریر خالص سیاسی قسم کی تھی۔ سوشلسٹوں کو بھی خوب لتاڑا اور اسلام پسند جماعتوں پر اس حوالے سے تنقید کی کہ وہ غریب اور مزدور کی بات کیوں نہیں کرتیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ایک روز سنا کہ شاہ جی گجرات ہی میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے ہیں اور چوک نواب صاحب کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیا کریں گے۔ چنانچہ میں نے باقاعدگی سے جمعہ کو وہاں حاضری دینی شروع کر دی،

میں ان دنوں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے افکار و خیالات سے بہت متاثر تھا۔ ان کی کتابیں پڑھ رکھیں تھیں بلکہ ان پر چاروں طرف سے جو حملے ہو رہے تھے' ان سے بھی خوب واقف تھا۔ شاہ جی جمعہ کے خطبے میں اکثر مولانا مودودیؒ کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' کو ہدف تنقید بناتے تھے۔ میں بڑے غور سے ان کی ہر تقریر سنتا اور پھر خط کی صورت میں ان کی بعض باتوں پر جرح کرتا۔ اتفاق سے شورش کاشمیریؒ کی لفاظی میرے ذہن میں خوب اتری ہوئی تھی۔ اسی اسلوب کی پیروی کرنے سے خط کی تحریر خطیبانہ ہی بن جاتی۔ شاہ جی کی اگلے جمعہ کی تقریر سے مترشح ہوتا کہ میرا خط پڑھ چکے ہیں۔

ایک روز میرے اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوان ساتھیوں اور یا مقبول جان اور جاوید احمد نے مجھ سے پوچھا کہ آپ شاہ جی کو خطوط وغیرہ لکھتے ہیں؟ میں نے اقرار کر لیا۔ دونوں دوست کہنے لگے، ہم شاہ جی سے ملتے رہتے ہیں۔ اگلے روز ہم نے انہیں کہا کہ آپ ہر جمعے مولانا مودودیؒ ہی کو موضوع کیوں بنا لیتے ہیں؟ وہ کہنے لگے' جماعت والے مجھے خط لکھتے ہیں۔ یہ خالد ہمایوں کون ہے؟ ہم نے کہا ہمارا ساتھی ہے' اسے آپ سے ملائیں گے۔ اگلے جمعہ کو نماز کے بعد میں اپنے ان دوستوں کی معیت میں شاہ جی سے ملا تو بے حد خوش ہوئے، گلے لگا لیا کہنے لگے تمہارے خطوں سے لگتا تھا کہ شاید تم کوئی روایتی سے مولوی ہو گے۔ اس کے بعد شاہ جی سے مسلسل نشست و برخاست رہنے لگی۔ ایک دفعہ وہ ہمارے گھر بھی آئے۔ والدہ صاحبہ نے فوراً ہمسائے سے اپنی بڑی بہن کو بھی بلا لیا کہ آؤ، بخاری صاحب کے صاحبزادے آئے ہیں، چنانچہ خالہ بھی آ گئیں۔ دونوں بہنوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا، دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ کہنے لگیں: امیر شریعتؒ جب سیالکوٹ کے جلسوں میں آتے تھے تو ہم بڑے ذوق شوق سے ان کی تقریر سننے جاتے تھے۔ اس وقت لوگ انہیں ڈنڈے والا پیر کے نام سے یاد کرتے تھے۔

گجرات کی سیاست پر عرصہ دراز سے دو گھرانوں کی اجارہ داری چلی آ رہی تھی۔ ایک گھرانے کا تعلق گوجر برادری سے تھا اور اسے انگریزوں سے نوابی ملی ہوئی تھی، اس لیے یہ لوگ نوابزادے کہلاتے تھے۔ دوسرا گھرانہ بٹ برادری کا نمائندہ تھا' چودھری ظہور الٰہی مرحوم اس کے سربراہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد چودھری صاحب نے کاروبار کو فروغ دیتے ہوئے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی سیاست نوابزادہ فیملی کے لیے بہت بڑا چیلنج بن گئی، ان دو گھرانوں کے سامنے کسی کا چراغ جلنا ناممکن تھا۔ شاہ جی دونوں گھرانوں کی منافقتوں کا بڑی دلیری کے ساتھ پردہ چاک کرتے۔ لوگ حیران ہوتے کہ گجرات کے بُت کدے میں یہ کون اذان دینے آ گیا ہے؟ شاہ جی تو ان بٹ برادران کو بھی معاف نہ کرتے جنہوں نے شاہ جی کو اپنی مسجد میں خطبہ جمعہ دینے کے لیے بلا رکھا تھا۔ شاہ جی کسی سے لیتے لواتے تو تھے نہیں اس لیے کسی مصلحت کا شکار ہونا جانتے ہی نہ تھے۔

شاہ جی تقریر تو اردو میں کرتے لیکن درمیان میں پنجابی محاورے اور ضرب الامثال بھی ٹانکتے چلے جاتے۔ شین قاف کی درستی کا یہ عالم کہ لگتا تھا دہلی اور لکھنؤ میں بھی عمر کا ایک حصہ گزار آئے ہیں۔ سرائیکی بلکہ روہتکیوں کی زبان بھی بول لیتے۔ فارسی، عربی اور اردو اشعار بلکہ پنجابی بولیوں اور ٹپوں سے بھی خوب کام لیتے، قرآن مجید کی قرأت بھی خوب لطف

دیتی تھی، جی چاہتا وہ پڑھتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ اپنے باپ دادا کی طرح قرآن کے حافظ تھے، تراویح بھی پڑھاتے تھے، زندگی کا مشاہدہ وسیع تھا۔ لوگوں کے غلط رویوں اور منافقتوں پر خوب گرجتے تھے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی خباثتوں اور جاہ پرستیوں کے یوں بخیے ادھیڑتے کہ شاید ہی کبھی کسی نے اس طرح زبان کھولی ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والوں کی ہر ہر ادا سے واقف تھے، ان سے بھی کبھی رورعایت نہ کرتے۔

شاہ جی مداہنت سے کام لینے والے نہ تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔ دوں فطرت لوگ بٹ برادران کے کان بھرتے کہ شاہ جی تو تمہیں بھی معاف نہیں کرتے۔ سچ سننا اور سنتے رہنا بڑے ظرف کی بات ہوتی ہے۔ بٹ برادران کے لیے بالآخر شاہ جی کی حق گوئی ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ شاہ جی نے ان کے تیور دیکھے اور سلسلہ خطابت وہاں سے منقطع کرلیا۔

مجلس احرار اسلام کا مرکزی دفتر دہلی دروازے (لاہور) سے مسلم ٹاؤن میں منتقل ہوا تو شاہ جی سے کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی۔ پھر وہ صاحب فراش ہوگئے۔ ایک اتوار میں اور ڈاکٹر شاہد محمود کاشمیری سارا دن ان کی خدمت میں بیٹھے رہے۔ دوپہر کے وقت مولانا عبدالقادر آزاد بھی مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے۔ شاہ جی کی صحت اب کے ایسی بگڑی کہ سنبھالا نہ لے سکی۔ کچھ خود بھی زیادہ دیر پرہیز کی قید میں رہنے والے نہ تھے۔ آخر ایک روز سن لیا کہ شاہ جی اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ آخری دیدار سے محرومی کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ رات بھر سفر کرکے دار بنی ہاشم پہنچا اور اگلی صبح ان کی آخری آرام گاہ پر حاضری دی۔ نزدیک ہی حضرت امیر شریعتؒ اور ان کے فرزندِ اکبر سید ابوذر بخاریؒ بھی آسودہ خاک ہیں۔ اسلام کے ان جلیل قدر فرزندوں کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنکھیں بھر آئیں۔ سوچنے لگا قدرت نے ہمیں ایسے بے لوث رہنما عطا کیے کہ جن کی زبان اور عمل میں فاصلہ نہ تھا، جن کی رفتار اور گفتار قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتی تھی۔ خدا کرے کہ ہم ان کے بتائے ہوئے رستے ہی پر چلتے چلتے ایک روز خدا سے جاملیں.....!

شورش کاشمیریؒ

علامہ اقبالؒ

میرا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں نے پچھلی صدی میں دو عظیم علمی وجود پیدا کیے ہیں۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد ۔ اوّل الذکر کو مسلمانوں کی بے پناہ عقیدت لے ڈوبی ہے اور ثانی الذکر کو مسلمانوں کی بے پناہ نفرت!

مسلمانوں نے علامہ اقبال سے جو عقیدت استوار کی ہے' اس کا رشتہ دماغ نہیں' قلب ہے اور ظاہر ہے کہ دل کی محبت ہمیشہ اندھی ہوتی ہے۔ مسلمان اقبال کے نام سے محبت کرتے ہیں لیکن اقبال کے کلام کو صرف گاتے یا گواتے ہیں۔

میرا یاراں غزل خوانے شمرند

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری زندگی پر سرسید کے بعد سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے ۔ وہ اپنے فکری خطوط کی بنیاد پر جس انقلاب کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے' اگر وہ برپا ہو تو مسلمانوں کی جدید صورتِ حالات کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی عملی زندگی اس کے فہم ہی سے معذور ہے!

اُن کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد کا تبحر علمی مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے ہتھے چڑھ گیا اور نتیجہ معلوم کہ مسلمانوں نے من حیث الجماعت اُن کے افکار کو بھی مہتم ٹھہرایا۔ دونوں ایک دوسرے کے معاصر تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے دور ۔ دونوں میں معاصر ہونے کا بُعد تھا۔ لیکن دونوں میں بعض باتیں قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی تھیں۔ مثلاً:

(۱) دونوں تخلیہ پسند تھے اور دونوں کو کبھی ہجوم کی معیت پسند نہیں آئی۔

(۲) دونوں کے گرد و پیش ایک خاص ڈھب کے عقیدت مند جمع ہوتے تھے۔

(۳) دونوں کے ذہنی خطوط دو مختلف تحریکوں اور دو مختلف رہنماؤں کی طرف راجع تھے۔

اقبال' قائدِ اعظم کو دیکھتے تھے اور خود گوشہ نشین تھے یعنی عمل سے الگ تھلگ گویا اِن کا فکر ہی ایک عمل تھا۔ ابوالکلام' گاندھی جی کے ہم قدم تھے اور اقبال کے برعکس اپنے نظریات کے لیے صعوبتیں بھی جھیلتے تھے۔

(۴) دونوں عوام میں گھلنے ملنے کی بہ نسبت عوام سے پرے رہنے میں ذہنی مسرت محسوس کرتے تھے۔

(۵) دونوں ''انا'' کے سدرۃ المنتہیٰ پر تھے۔

(۶) دونوں کی ذاتی زندگی کے اعمال و افعال میں شروع سے آخر تک' عجیب و غریب یکسانیت پائی جاتی ہے جس سے (INTELECTUAL) کی سیرت سے برگ و بار سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

راقم الحروف کو حضرت علامہ سے ذاتی نیاز حاصل نہ تھا۔ ایک دفعہ اسکول لائف میں ہم دو چار دوست اُن کے ہاں سلام عقیدت کے لیے گئے تو حضرت علامہ نے جو کوٹھی کے برآمدے ہی میں کھڑے تھے' ملنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ نہایت درشت لہجہ میں فرمایا: واپس جاؤ!

۱۹۳۶ء میں مولانا ظفر علی خان کی معرفت ان سے تعارف ہوگیا۔ مگر ان سے میل ملاپ میرے خیال میں چنداں آسان نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بڑے ہی سخت مزاج تھے۔

آزاد ہند فوج میں جس خاتون نے رانی جھانسی کا لقب پایا' غالباً اس کی والدہ ۱۹۳۷ء میں مختلف شہروں کا دورہ کر رہی تھیں۔ مدراس سے لاہور پہنچیں، علامہ اقبال کے ہاں گئیں۔ اتفاق سے مولانا ظفر علی خان اور راقم 'علامہ کے ہاں موجود تھے اور حضرت علامہ ہمیں صحن میں بٹھا کر خود اندر کھانا کھانے تشریف لے گئے تھے۔ وہ خاتون جلدی میں اندر ہی چلی گئیں لیکن الٹے پاؤں منہ بسورے واپس آئیں۔ مولانا ظفر علی خان نے دریافت کیا تو پتا چلا حضرت علامہ نے سخت الفاظ میں ڈانٹا ہے۔ اتنے میں علامہ بھی باہر تشریف لے آئے۔ اُن کا غصہ اور تیز ہوگیا۔ بڑے ہی تیز کلمے کہے اور جب وہ بیک بینی دو گوش نکل گئی تو فرمایا:

دیکھئے نا! یہ بڑھیا جوان لڑکی ساتھ لیے پھرتی ہے اور اس پر کتا مستزاد ہے۔ اس کو خبر نہیں کہ یہ مسلمان کا مکان ہے۔

سوءِ اتفاق سمجھئے کہ حضرت علامہ کو مزید ایک دو بار اسی مزاج میں پایا۔ آج تک میرا ذہن عقیدت مندی کے باوجود اس خیال میں پکا ہے کہ وہ مزاجاً ''نسیم سحر'' نہ تھے.....،

خود مولانا ابوالکلام آزاد اسی مزاج کے بزرگ ہیں۔ اُن کی طبیعت میں بھی استغنا، مزاج میں انا اور چہرے پر بے نیازی مسلط ہے۔ وہ عقیدت مندوں کو ہمیشہ کھیت کی کھاد سمجھتے ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری جو علامہ اقبال کے مخلصین میں سے تھے' عموماً کہا کرتے ہیں:

''اقبال کا قلم تمام عمر صحیح رہا اور قدم اکثر و بیشتر غلط۔''

لیکن اُن کا یہ خیال کچھ جچتا نہیں۔ کیونکہ اقبال نے کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا' وہ یا تو پکارتا رہا یا للکارتا رہا یا پھر یرے کی طرح لہراتا رہا!

وہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

میں اقبالؒ کو مشرق کا کارل مارکس سمجھتا ہوں اور کارل مارکس کو مغرب کا اقبال۔ اور جب مجھ سے میرے دوست اس کی توجیہہ چاہتے ہیں تو میرا وجدان الفاظ کو گنگ پاتا ہے!

مسافرانِ آخرت

☆ چیچہ وطنی میں ہمارے قدیم ساتھی رضوان الدین صدیقی اور سراج الدین صدیقی کی خالہ ماجدہ ۲۷ ستمبر ۲۰۰۶ء کو انتقال کر گئیں۔ اُن کا نمازِ جنازہ قائدِ احرار حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری نے پڑھائی۔

☆ دفتر احرار چیچہ وطنی کے سابق ناظم طارق سلیم (جو حافظ محمد اسماعیل صاحب ٹوبہ ٹیک سنگھ کے قریبی عزیز ہیں) رمضان المبارک میں چیچہ وطنی میں انتقال کر گئے۔

قارئین سے تمام مرحومین کی دعائے مغفرت کی درخواست ہے (ادارہ)

محمد اورنگ زیب اعوان

صاحبزادہ طارق محمود رحمۃ اللہ علیہ
اک شجرِ سایہ دار تھا نہ رہا

۱۲ ستمبر کو عصر کے بعد اسلام آباد سے مولانا عبدالقدوس محمدی نے موبائل پر پیغام بھیجا کہ ''صاحبزادہ صاحب کے بارے میں اطلاع ملی؟'' یہ پیغام پڑھتے ہی ماتھا ٹھنکا کہ اللہ خیر کرے صاحبزادہ صاحب کو کیا ہوگیا؟ مولانا محمدی کا موبائل نمبر ملایا وہ مصروف تھا۔ فیصل آباد صاحبزادہ طارق محمود صاحب کے گھر نمبر ملایا' وہ بھی مصروف.....اب ان کا موبائل نمبر ملایا تو برادرم حافظ مبشر محمود سے بات ہوئی۔ انہوں نے یہ دل خراش، اندوہناک اور افسوسناک خبر سنائی کہ ''ابو کا انتقال ہوگیا ہے اور کل بروز بدھ ۱۰ بجے جنازہ ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آخر دلِ بے قرار کو قرار آ ہی گیا

صاحبزادہ طارق محمود عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ممبر، عظیم خطیب، بہترین ادیب، میرے مربی و محسن اور مشفق و مہربان تھے۔ ان کی وفات سے ایک کہانی ختم ہوگئی۔ ایک باب بند ہوگیا کیونکہ مرحوم بے شمار خوبیوں، ان گنت اوصاف اور خوبیوں کے مالک ایک تاریخی انسان تھے۔

صاحبزادہ طارق محمود اپنے عظیم والد حضرت مولانا تاج محمود قدس سرہٗ کی رحلت کے بعد میدانِ عمل میں آئے مگر خطابت اور صحافت دونوں محاذوں پر اپنے والد گرامی کی عظیم روایات کو زندہ و تابندہ رکھا اور بہت کم مدت میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ اپنا مقام پیدا کیا، خطابت و صحافت کے میدان میں بہت جلد اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کی مقدس جدوجہد ہو کہ ردِّ قادیانیت کا محاذ، جامع مسجد محمودؒ کی خطابت ہو کہ ماہنامہ ''لولاک'' کی ادارت صاحبزادہ طارق محمود نے جہدِ مسلسل اور عزم پیہم کے ساتھ ہر معرکہ سر کیا۔ ۲۳ سال اپنا خون جگر دے کر اپنے والد مرحوم کے عظیم مشن کی آبیاری کی۔ ہر دکھ، مصیبت، تکلیف اذیت کو خندۂ پیشانی سے قبول کیا مگر پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی، فقر و فاقہ میں رہ کر بھی اپنی خودی کو سربلند رکھا اور اپنی خودداری پہ حرف نہ آنے دیا۔

صاحبزادہ طارق محمودؒ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ کی گود میں کھیلے، مولانا محمد علی جالندھریؒ، آغا شورش کاشمیریؒ کی صحبتیں اٹھائیں اور خطابت و صحافت میں مقامِ بلند پایا۔ صاحبزادہ طارق محمودؒ منبر و محراب میں اپنے والد مرحوم کی عشق رسالت مآب ﷺ میں ڈوبی خطابت کے امین تھے تو سٹیج پر آغا شورش کاشمیریؒ کی فصاحت و بلاغت اور گھن گرج کے وارث.....!

ان کی تئیس سالہ صحافتی خدمات کے لیے ماہنامہ ''لولاک'' اور قومی اخبارات کے فائل دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان

کے خطبات جمعۃ المبارک کا مجموعہ ''صدائے محراب'' اور ''ذوق بیان'' آج ہر لائبریری کی زینت اور ہر خطیب کی ضرورت ہے۔ ''قادیانیت کا سیاسی تجزیہ'' ۶۷۹ صفحات کا عظیم علمی و تحقیقی کارنامہ ہے جس نے قادیانیت کے مکروہ چہرے سے نقاب الٹ کر اس کی اصلی شکل دکھادی کہ یہ کوئی مذہبی نہیں خالصتاً اسلام دشمنوں کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے معرض وجود میں آنے والی جماعت ہے۔ ''سفر دیدہ نم'' ۱۳۶ صفحات پر مشتمل حرمین شریفین کا ایک خوبصورت، علمی و ادبی اور تحقیقی سفر نامہ ہے۔ صاحبزادہ طارق محمودؒ کی تحریر پڑھ کر بے ساختہ لبوں پر آتا ہے کہ آپ مولانا ظفر علی خان، چودھری افضل حق اور آغا شورش کاشمیری کے قلم کے وارث تھے۔ بطور مثال ان کے ایک گرامی نامہ کا اقتباس پیش خدمت ہے۔

> ''ہم لوگ نہ شاعر ہیں نہ ساحر کہ ہر دَم قلم کا جادو جگاتے رہیں، شاعروں کی صحبت نے طبعاً شاعر بنادیا ہے اسی باعث میری تحریر کبھی مغربی لباس کی طرح مختصر اور کبھی عربی لباس کی طرح پھیل جاتی ہے۔ تم میری ذہنی و قلبی کیفیات سے واقف ہو۔ چودھری افضل حق مرحوم نے خوب کہا ہے کہ عاشق صادق کو جو مزہ ہجر و فراق میں ملتا ہے وہ وصال میں نہیں ملتا۔ ہمارے ہاں وصال کا نام و نشان نہیں البتہ شب غم اتنی طویل ہے کہ ہجر و فراق کا لامتناہی سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اسی کیفیت کے باعث ہم ایسے لوگوں کی تحریر کبھی شرمیلی دلہن کی طرح سمٹ کر مختصر اور کبھی انتظار کی طرح دراز ہو جاتی ہے۔ سورج بہت بڑا ہے لیکن آوارہ بادل کا ایک معمولی ٹکڑا کس طرح اُسے چھپا دیتا ہے۔ میرے خطوط میں سورج اور بادل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خط مختصر ہو تو محبوب کا تبسم سمجھ کر قبول کرلو، طویل ہو تو مُحب کی شوخی تصور کر لینا۔'' (راقم کے نام خط بتاریخ ۲۸ ستمبر ۲۰۰۳ء)

صاحبزادہ طارق محمود کی زندگی جرأت و بہادری اور ایثار و قربانی سے عبارت تھی۔ تقریر اور تحریر دونوں میں اپنی مثال آپ تھے۔ مرحوم مہمان نواز اور دل کے غنی تھے، ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا، مہمانوں کو تواضع کر کے دلی خوشی محسوس کرتے تھے۔ احرار کے آنگن میں انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور احرار کی روایات کو تادمِ آخر نبھایا۔ میری ان سے پہلی ملاقات شبان تحفظ ختم نبوت ہری پور ہزارہ کے زیر اہتمام منعقدہ ختم نبوت کانفرنس ۱۹۸۷ء میں ہوئی تھی جبکہ آخری ملاقات ۷ ستمبر ۲۰۰۶ء کو مجلس احرار اسلام لاہور کے زیر اہتمام منعقدہ ختم نبوت کانفرنس میں ہوئی۔ نواسہ امیر شریعت مخدوم مکرم و معظم جناب سید محمد کفیل بخاری کے حکم کی تعمیل میں راقم پشاور سے فیصل آباد پہنچا۔ ۷ ستمبر کا سارا دن صاحبزادہ صاحب مرحوم کی معیت میں گزرا۔ عصر کے قریب پیکر اخلاص برادرم محمد محمود صاحب کی گاڑی میں لاہور کے لیے روانگی ہوئی، سارے راستہ میں حسب معمول اکابرین کے تذکرے ہی ہوتے رہے۔ عشاء کے قریب لاہور پہنچے۔ دفتر احرار میں منعقدہ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ، مولانا عبدالمالک (منصورہ)، مولانا مفتی حمیداللہ جان، جناب مجیب الرحمٰن شامی، مولانا محمد امجد خان، جناب عبداللطیف خالد چیمہ، پروفیسر خالد شبیر احمد، مولانا محمد ندیم قاسمی، قاری ابوبکر صدیق اور دیگر رفقاء سے ملاقات ہوئی۔

صاحبزادہ طارق محمود مرحوم نے کانفرنس سے خطاب کیا۔ جس نے آغا شورش کاشمیریؒ کی یاد تازہ کردی۔ (اس

خطاب کو علیحدہ سے ''نقیبِ ختم نبوت'' میں شائع کیا جا رہا ہے) پروگرام سے فارغ ہو کر صاحبزادہ صاحب مرحوم نے کھانا کھایا اور پھر فیصل آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہی میری اِن سے آخری ملاقات اور آخری سفر تھا۔ پہلی ملاقات بھی ختم نبوت کانفرنس میں ہوئی اور آج ۱۹ سال بعد آخری ملاقات بھی ختم نبوت کانفرنس ہی کے موقع پر ہوئی:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

میری اُن سے ۱۹ سالہ جماعتی تعلق کی بہت ساری یادیں ہیں۔ ان کی بہت زیادہ شفقتیں اور عنایات مجھ پر تھیں۔ میرے ذاتی معاملات میں بھی اُن کے بہت سارے احسانات اور کرم نوازیاں میرے شامل حال رہیں۔ اِن سے وابستہ یادوں اور باتوں کا دیوان ایک مختصر سے مضمون میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ میری اِن سے بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ وہ میری ہر خوشی غمی میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تو ہری پور تشریف لائے اور جنازہ پڑھایا۔ میری شادی میں مع اہل خانہ شریک ہوئے اور میرا نکاح بھی پڑھایا۔

۱۳ ستمبر ۲۰۰۶ء بروز بدھ ان کی نمازِ جنازہ کے موقع پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ان کے جنازہ نے ان کے والد مولانا تاج محمود مرحوم کے جنازہ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ پورے ملک کی دینی قیادت نمازہ جنازہ میں شریک ہوئی۔ ایک جم غفیر تھا جو اپنے محبوب رہنما کے آخری دیدار اور جنازہ کو کندھا دینے کے لیے بے تاب تھا۔ نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور تاج وتخت ختم نبوت زندہ باد کے پر جوش نعروں کی گونج میں انہیں سپرد خاک کیا گیا۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

جس طرح صاحبزادہ طارق محمودؒ نے اپنے والد مولانا تاج محمودؒ کے جنازہ کے بعد تعزیتی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ

''قادیانیو! مولانا تاج محمود ہمارے لیے مرے ہیں، تمہارے لیے نہیں۔ اب طارق محمود تمہیں تاج محمود بن کر دکھائے گا۔''

اسی طرح تعزیتی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ان کے صاحبزادہ حافظ مبشر محمود نے جب اس عزم کا اعلان کیا کہ:

''میرے والد صاحبزادہ طارق محمود کی وفات پر خوشیاں منانے والے قادیانیو! تمہیں خوش نہیں ہونا چاہیے
میں صرف طارق محمود بن کر نہیں بلکہ مولانا تاج محمود بن کر تمہارا مقابلہ کروں گا۔''

سچ ہے کہ جب تک امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے رضا کار موجود ہیں۔ عقیدۂ ختم نبوت پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

اک اک کر کے بجھے جاتے ہیں ماضی کے چراغ
ہم ہی رہ گئے بس اشک بہانے والے

ترجمہ وتلخیص: فدا محمد عدیل (دوسری قسط)

گوانتاناموبے میں کیا قیامت ڈھائی جارہی ہے؟

پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف
امریکی عقوبت خانے میں گزرے لہورنگ شب وروز کی دل گداز روداد بیان کررہے ہیں

امریکیوں کو حوالگی:

''خدا حافظ'' کے الفاظ سننے کے بعد میں نے کچھ لوگوں کی آوازیں سنیں جو انگریزی میں باتیں کررہے تھے۔ پھر اچانک وہ لوگ ریچھوں کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوگئے اور مجھ پر لاتوں، گھونسوں اور مکوں کی بارش کرنے لگے۔ یہ سب اتنا اچانک تھا کہ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ میرے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی گئی، کبھی اوندھے منہ لٹا دیا جاتا، کبھی کھڑا کرکے دھکا دے دیا جاتا، میرے کپڑے چاقوؤں کی مدد سے پھاڑ دیئے گئے۔ اس دوران میری آنکھوں پر بندھی پٹی اتر گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک طرف پاکستانی فوجی قطار بنائے کھڑے تھے جبکہ ساتھ ہی آفیسرز کی گاڑیاں تھیں جن میں ایک پر جھنڈا لگا ہوا تھا۔ امریکیوں نے مجھے مارا پیٹا اور بے لباس کردیا مگر اسلام کے یہ محافظ ''میرے سابقہ دوست'' تماشا دیکھتے رہے۔ ان کے لبوں پر لگے تالے میرے لیے ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے میری حوالگی کے سارے تقاضے پورے کررکھے تھے۔ یہ وہ لمحات تھے جن کو میں قبر میں بھی نہ بھول سکوں گا۔ میں کوئی قاتل، چور، ڈاکو یا قانون کا مجرم نہیں تھا۔ مجھے بغیر کسی جرم کے امریکہ کے حوالے کیا جارہا تھا۔ وہاں موجود آفیسرز کم از کم اتنا تو کہہ سکتے تھے کہ یہ ہمارے مہمان ہیں، ہماری موجودگی میں ان کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے۔ وحشی، متعصب اور بے رحم امریکی فوجیوں نے ایسی حالت میں مجھے زمین پر پٹخ دیا کہ میرا جسم ننگا تھا۔ پھر مجھے ہیلی کاپٹر میں دھکیلا جہاں میرے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے کس کے باندھ دیئے گئے اور آنکھوں پر پٹی بھی دوبارہ باندھی گئی۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ میرے چہرے کو سیاہ تھیلے سے بھی ڈھانپ دیا۔ پھر میرے اردگرد سے پاؤں تک رسی باندھی اور ہیلی کاپٹر کے وسط میں زنجیر سے باندھ دیا۔ ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوگیا۔ میں جب حرکت کی کوشش کرتا تو زوردار لات پڑتی۔ مجھے لگا کہ آنے والے چند لمحوں میں میری روح اور جسم کا رشتہ ختم ہونے والا ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ میں کتنی دیر تک اس کرب میں مبتلا رہا۔ آخر کار ہیلی کاپٹر ایک جگہ اترا۔ وحشی امریکی درندوں نے ہیلی کاپٹر سے گھسیٹتے ہوئے مجھے نیچے پھینک دیا۔ جس کے ساتھ ہی وہاں پہلے سے موجود دوسرے امریکی بھی مجھ پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگے اور میرا وہ حال کیا جو بیان سے باہر ہے۔ الٹا لٹا کر میرے اوپر چار پانچ افراد بیٹھ گئے اور ایسی باتیں کرنے لگے جیسے کسی اجلاس میں بیٹھے ہوں۔ میری سانس نہیں نکل رہی تھی، بے اختیار دل ہی دل حضرت عزرائیل کو پکار رہا تھا کہ اے عزرائیل کہاں ہو؟

مجھے اس جگہ دو گھنٹے اسی کرب میں رکھا گیا پھر دوسرے ہیلی کاپٹر میں سوار کرا کر ایک آہنی کرسی سے باندھ

دیا گیا۔اب کی بار مجھے مارنہیں پڑ رہی تھی ۔۲۰/ ۲۵ منٹ بعد ہیلی کاپٹر نیچے اترا ۔ مجھے اندر ہی کھڑا کیا گیا ۔ یہاں متعدد جہازوں کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں ۔ مجھے نیچے اتار کر چہرے سے نقاب ہٹا دیا گیا اور آنکھوں کی پٹی بھی اتار دی گئی ۔ دیکھا کہ چند امریکی فوجی کھڑے ہیں ۔ بائیں جانب ایک قید خانہ نظر آیا جس میں چند قیدیوں کو باندھا گیا تھا ۔اسی جگہ مجھے بھی ڈال دیا گیا ۔ یہاں موجود ایک چھوٹے سے واش روم میں مجھے منہ ہاتھ دھونے کو کہا گیا مگر میرے ہاتھوں میں سکت نہیں تھا ۔ میں نے اتنا کیا کہ خود کو گیلا کر دیا پھر مجھے ایک چادر دے کر ایسے کمرے میں لے جایا گیا جو دو میٹر لمبا اور ایک میٹر اونچا تھا ۔رفع حاجت کی جگہ بھی اتنی سی جگہ میں تھی ۔ کمرے کی دیواریں آہنی تھیں ۔اوپر سے مضبوط آہنی جالیاں بھی لگائی گئی تھیں ۔ مجھے سونے کے لے کہا گیا مگر نہ بستر تھا نہ تکیہ ۔ حیران تھا کہ میں کہاں لا گیا گیا ہوں اور مزید کس سلوک کا سامنا کرنا پڑے گا ؟

میری بائیں جانب ایک بڑا کمرہ تھا جس میں بھی مجاہدین کو رکھا گیا تھا ۔ان کو بھی میری گرفتاری کا پتا چل گیا ۔ہم ایک دوسرے کو صرف دیکھ سکتے تھے ، باتیں کرنے کی اجازت نہ تھی ۔ دیکھنے کا موقع بھی تب ملتا تھا جب کھانا تقسیم ہوتا تھا ۔ چند دن یہاں رہنے کے بعد پتا چلا کہ ملا فاضل محمد ،نور اللہ نوری ، برہان رفیق اور غلام روغانی بھی یہاں ہیں ۔ یہ طالبان مجاہدوں کے رہنماؤں میں سے تھے ۔ ہمارے مابین بات چیت نہ ہوتی تھی ۔ایک دن مجھے ہتھکڑی پہنا کر ایک دوسرے کمرے لے جایا گیا جہاں تفتیش کا پہلا مرحلہ شروع ہونا تھا ۔ میری انگلیوں کے نشانات لیے گئے ،فوٹو گرافی ہوئی اور بائیو گرافی لکھی گئی ۔اس کے علاوہ کوئی سوال جواب کیے بغیر واپس اسی قید خانے میں لایا گیا جہاں رات کا کھانا پلاسٹک کے برتنوں میں پڑا ملا ۔ ہلکا پھلکا کھانے کے بعد برتن فوجیوں کو واپس کر دیئے جس کے بعد سونے کا ارادہ باندھا ۔ابھی آنکھیں بند ہی ہو رہی تھیں کہ فوجیوں کے شور سے جاگ گیا ۔ مجھے پکڑ کر دوبارہ تفتیش والے کمرے میں لے جایا گیا' جہاں پہلی دفعہ مجھ سے اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے بارے میں سوالات پوچھے گئے اور نائن الیون کے بارے میں پوچھا گیا ۔ میرے سارے جوابات نفی میں تھے' جس سے شاید ان کو پتا چل گیا کہ میرے پاس مطلوبہ معلومات نہیں ہیں ۔ یہ وہ سوالات تھے جن کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہزاروں بے گناہ افغان شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ۔ دہشت گردی وہ ''مکا'' ہے جسے امریکہ کسی بھی وقت کسی کے منہ پر بھی مار سکتا ہے ۔اسی دہشت گردی کے نام پر افغانستان اور عراق پر قبضہ جمایا گیا ۔

سوال جواب کا یہ سلسلہ پانچ دن تک مسلسل جاری رہا ۔ میرے لیے اچھی بات یہ تھی کہ مار پیٹ نہ تھی ۔ پھر ہمیں باگرام لے جانے کے لیے یونیفارم دیا گیا ۔ میرے اور دوسرے ساتھیوں کے یونیفارم میں فرق تھا ۔ مجھے خاکی ان کو آسمانی رنگ کا یونیفارم دیا گیا ۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں پلاسٹک کی رسیوں سے باندھے گئے ،سر کو سفید پلاسٹک کے لفافے میں ڈھانپ کر گلے کے نزدیک لفافے کا منہ باندھ دیا گیا' جس سے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا ۔ہم سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا ۔ ہمارے ساتھیوں میں ایک عرب اور ایک امریکی مسلمان بھی تھا ۔ میں نواں قیدی تھا ۔ میں نے پانی مانگا مگر نہیں دیا گیا ،تھیلا بھی نہیں ہٹایا گیا ۔صرف ہیلی کاپٹرز کی آوازیں اور امریکیوں کا شور سنائی دے رہا تھا جو بار بار SHUT UP اور DONT MOVE کہتے رہے ۔ یہ سلسلہ تین گھنٹے جاری رہا پھر ہیلی کاپٹر میں چڑھا کر دوسری جگہ منتقل کیا گیا ۔تقریباً ۲۵ منٹ بعد ہیلی کاپٹر اترا اور ہمیں نیچے پھینکا گیا ۔ یہاں بھی نئے فوجیوں نے ہم پر یلغار کر دی ،کبھی لاتوں سے مارتے تھے ،کبھی ہمارے جسموں

پر چھلانگیں لگاتے تھے۔ ہمارے ہاتھ پیچھے باندھے گئے تھے۔ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں بوٹوں سے مسلتے تھے۔ ایک امریکی جنرل نے میری شکل دیکھنا چاہی، میرے چہرے پر سے تھیلا ہٹایا گیا، جنرل نے دیکھا اور کوئی بات کہے بغیر دوبارہ ڈھانپنے کا اشارہ کیا۔ یہاں تین گھنٹے انتظار کرایا گیا۔ پانی دیا گیا، نہ نماز پڑھنے دی گئی۔ ہم سب نے اشاروں سے نماز پڑھی۔ اس دوران ضربیں دی جاتی رہیں۔ رات کو ایک جہاز آیا جس میں ہم نو افراد کو چڑھایا گیا۔ جہاز کا یہ سفر اب بھی یاد آئے تو کانپنے لگتا ہوں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ پل صراط تھا اور نزع کی حالت تھی۔ جہاز میں میرے پاؤں اور سینے کو کس کے باندھا گیا اور ایسی حالت میں سب کو رکھا گیا کہ نہ بیٹھ سکتے تھے اور نہ لیٹ سکتے تھے۔ کمر کے درد سے ہماری چیخیں نکل رہی تھیں مگر سوائے صبر کے کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی کمر کو ٹیک لگاتے تو زوردار لاتیں پڑتیں تھیں۔ ہم خود کوئی بات کر سکتے تھے اور نہ کوئی ترجمان تھا۔ یہ بہت تکلیف دہ لمحات تھے۔ راستے میں دو مرتبہ جہاز اڑا، پھر اترا، بہت دیر بعد جہاز اترا۔ یہ بگرام ائیر پورٹ تھا۔

فوجیوں نے میری رسیاں کھولیں اور رن وے پر انتہائی بے دردی سے پھینکا۔ فوجی THIS IS THE BIG ONE کہہ کہہ کر مجھ پر حملہ آور ہو جاتے اور لاتوں، گھونسوں اور مکوں کی بارش کر دیتے۔ اس سے بھی ان کا غصہ کم نہیں ہوا، پھر مجھے بندوقوں کے بٹ مارے گئے۔ میرا جسم ننگا ہو گیا تھا مگر چہرے پر وہی تھیلا، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ اسی حالت میں مجھے برف پر پھینکا گیا۔ بگرام میں اس دن تازہ برفباری ہوئی تھی۔ مجھ پر تشدد کے دوران وہاں موجود امریکی عورتوں اور مرد فوجیوں نے گانا شروع کر دیا۔ ان کے جو شعر مجھے سمجھ آ رہے تھے، وہ یہ تھے:

''امریکہ عدل وانصاف کا گھر ہے
عدل وانصاف کا طرف دار ہے
اور ہر کسی کے لیے انصاف چاہتا ہے''

ہمارے ساتھ ہونے والا وحشیانہ سلوک امریکیوں کو انصاف لگ رہا تھا۔ سخت سردی سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ بار بار کہا جاتا "STOP MOVEMENT" مگر کپکپی روکنا میرے بس میں کہاں تھا۔ اس ظلم اور ناروا سلوک کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں کسی چیز کا پتا نہیں چلا۔ ہوش میں آیا تو بڑے کمرے میں پڑا تھا۔ نو دس بجے دن کا وقت تھا، سارے بدن میں درد تھا، جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ چھے فوجیوں نے میرے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا جن میں دو نے چہرے چھپا رکھے تھے اور ہاتھوں

افغانستان کی مٹی

بگرام میں امریکیوں کی قید کے دوران قطر سے تعلق رکھنے والے ایک مجاہد سالم نے جو واقعہ نم آنکھوں سے سنایا، وہ میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ سالم نے بتایا: ''افغانستان میں طالبان پر آزمائش آ پڑی تو کوئی مجھے، میری بیوی اور ننھی بچوں کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہم بمباری سے کبھی یہاں بھاگتے تھے، کبھی وہاں۔ ایک دن ہماری معصوم بچی جس نے ابھی ابھی بولنا شروع کیا تھا، اپنی توتلی زبان میں سردی کی شکایت کی۔ میں اور میری بیوی نے بے بسی سے رونا شروع کر دیا کیونکہ ہم اپنی بچی کو سردی سے بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ میں نے خدا خدا کر کے بیوی اور بچی کو چمن پہنچایا۔ ہمارے ساتھ کچھ دیگر عربی خواتین بھی تھیں۔ ہم جب افغان سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے لگے تو خواتین نے افغانستان کی مٹی اپنے دوپٹوں کے ساتھ باندھنا شروع کر دی۔ میں نے پوچھا: ''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' جواب ملا: ''معلوم نہیں پھر کبھی افغانستان کی سرزمین دیکھنا نصیب ہو گی یا نہیں؟ افغانستان کی مقدس مٹی جہاد کی مٹی ہے اور واحد ملک ہے جہاں اللہ کے دین کا نفاذ ہوا۔'' سالم اپنے بچوں کے احوال سے لاعلم تھا اور بار بار پوچھتا کہ معلوم نہیں پاکستانیوں نے میری بیوی اور بچی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا؟

میں ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے۔ دو دوسرے کالے رنگ کے فوجیوں نے میرے سر پر پستول تان رکھے تھے جبکہ سامنے دو اور فوجیوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ہر فوجی نے چیخ کر باری باری پوچھا، بتاؤ اسامہ کہاں ہے؟ ملا عمر کہاں چھپا ہوا ہے؟ تم نے نیویارک اور واشنگٹن میں کیا کیا؟ میں چھے بندوں میں ننگا پڑا تھا۔ کیا انصاف ہے امریکہ کا؟

درد اور تکلیف سے میری آواز نہیں نکل رہی تھی، دانتوں اور زبان میں درد تھا۔ یہ ایسا لمحہ تھا کہ میں مرنا چاہتا تھا مگر میری یہ خواہش بھی پوری نہ ہو رہی تھی۔ جب ان کو پتا چلا کہ میں بات نہیں کر سکتا اور ان کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتا تو انہوں نے کچھ دیر کے لیے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھے ایک سبز چادر میں لپیٹا اور ایک ٹھنڈے کمرے میں ڈال دیا۔ میری حالت انتہائی خراب تھی۔ صرف ایک چادر کے علاوہ میرے جسم پر کچھ بھی نہ تھا۔ درد کے بارے میں پھر بے ہوش ہو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھولی تو ایک رضائی میرے اوپر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر وہ بندھے ہوئے تھے۔ بہت کوشش کے بعد اپنے سر کو رضائی سے باہر نکالنے میں کامیابی ملی تو ایک امریکی خاتون فوجی کو دیکھا جو کمرے کے دروازے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ قریب آئی اور نرم لہجے میں پوچھا: کیسے ہیں آپ؟ میں نے پہلی دفعہ کسی امریکی کو انسانیت کا مظاہرہ کرتے دیکھا تھا۔ میں جواب نہ دے سکتا تھا۔ خاتون نے پھر پوچھا: انگریزی آتی ہے؟ میں نے ہونٹوں کو حرکت دینا چاہی مگر ایسا کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ شاید خاتون سمجھ گئیں، واپس پلٹیں اور کرسی پر بیٹھ گئیں۔

میرا خیال تھا کہ یہ گوانتاناموبے کا جزیرہ ہوگا مگر کمرے کی دیواروں پر پشتو زبان میں طالبان کی تحریریں دیکھیں، جن کے ساتھ تاریخیں بھی لکھی ہوئی تھیں تو یقین آ گیا کہ یہ گوانتاناموبے نہیں افغانستان کا ہی کوئی علاقہ ہے۔ میں دورانِ قید ایک بھی نماز نہ پڑھ سکا، کھانا نہ پینا، نیند بھی صرف وہی تھی جو بے ہوشی کی حالت میں ہوتی۔ سارا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور بدن سے درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ وقت اسی فکر میں گزرتا کہ آگے کیا ہوگا؟ شام کو حالت تھوڑی سنبھلی اور زبان کو حرکت ملنے لگی۔ اس دوران دوسرے فوجی آ گئے۔ جن سے میں نے انتہائی نحیف آواز میں پوچھا: Can you help me? انہوں نے پوچھا کس چیز کی ضرورت ہے؟ میں نے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی جو انہوں نے دے دی۔ میں نے بندھے ہاتھوں سے تیمّم کیا اور بیٹھ کر نماز پڑھنا شروع کی۔ اس دوران دو فوجی میرے قریب بیٹھ گئے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے نماز مکمل نہیں پڑھنے دیں گے مگر اللہ نے رحم کیا اور میں نے پوری نماز پڑھ لی۔

سلام پھیرنے کے بعد ایک فوجی 'جو وردی میں تھا' نے ایرانی فارسی میں صحت دریافت کی۔ کھانے کے بارے میں دریافت کیا اور پوچھا سردی تو نہیں لگی؟ ہر سوال پر میرا جواب ''الحمدللہ'' ہوتا۔ شکایت کرتا اور نہ کچھ مانگتا تھا۔ میں شکایت کیوں کرتا۔ میرے حال سے سب واقف تھے اور اگر کوئی واقف نہ تھا تو اس کو میرے جسم اور چہرے پر لگا خون صاف نظر آتا تھا۔ انہوں نے اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اور میری طرف سے ہر سوال کا جواب نفی میں پایا تو ان کا رویہ سخت ہو گیا۔ ان کے سخت رویئے نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ میرے یہاں چھے روز مکمل ہو گئے تھے۔ ان چھے دنوں میں' میں نے کھانا نہیں کھایا کیونکہ جو خوراک وہ دیتے تھے' اس بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ حرام ہے یا حلال؟ ٹھیک چھے دن بعد مجھے ایک گلاس چائے کے ساتھ آدھی افغانی روٹی دی گئی جس کے بعد چائے کے ساتھ ایک روٹی روزانہ دی جانے

لگی۔ میں نے پورا ایک مہینہ اسی طرح گزارا۔ پہرے پر مامور فوجیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ مجھے نیند کے لیے نہ چھوڑا جائے۔ میں بیس دن تک بے خوابی کا شکار رہا، نہ کھانا وقت پر ملتا اور نہ ہاتھ پاؤں کھلے۔ روزانہ وہی دو افراد آتے اور ایک ہی قسم کے سوالات پوچھتے رہتے۔ میں کمرے میں اکیلا ہوتا تھا۔ کوئی نظر آتا تھا اور نہ کسی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بیس دن بعد مجھے ایک چھوٹے سائز کا قرآن مجید کا نسخہ دیا گیا جس کی وجہ سے میری مصروفیت پیدا ہوگئی۔ شاید ۲۴ یا ۲۵ جنوری ۲۰۰۲ء کا دن تھا۔ صبح نو بجے کے قریب اچانک میرے کمرے میں ایک دوسرے قیدی کو لایا گیا جس کے کچھ وقفے کے بعد چھ مزید قیدیوں کو لایا گیا۔ ان سب کو مضبوط رسیوں سے باندھا گیا تھا اور سب کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئی تھیں۔ ان کے ساتھ عربی بولنے والے تفتیش کار بھی تھے۔ جنہوں نے ان قیدیوں کو آپس میں بات نہ کرنے کا حکم دیا۔ فوجیوں نے دروازے کے سامنے بڑا تختہ رکھا اور دو مسلح فوجیوں کو کمرے کے اندر ہی پہرہ دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی مگر قیدیوں نے تھوڑی دیر بعد باتیں شروع کر دیں۔ میں خاموش رہا۔ ایک عربی تفتیش کار نے آ کر ان کو چپ کرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک عرب بھائی نے مجھ سے پوچھا: آپ ضعیف ہیں؟ میں نے کہا: ہاں وہی ہوں۔ پھر دوسرے بھائیوں نے بھی اپنا تعارف کرایا۔ ان میں سالم قطر، سلمان یمن، شیخ فیض کویت، سمیر الجزائر، طارق الجزائر (جس کے پاس برطانیہ کی شہریت بھی تھی) اور محمد قاسم حلیمی کا تعلق افغانستان سے تھا۔ ان سب کو عصر تک میرے ساتھ ساتھ رکھا گیا۔ شام کو یہ سارے افراد واپس لے جائے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے ان قیدیوں کے ساتھ جو لمحات گزارے ان سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ رات گزری، صبح ان کو دوبارہ لایا گیا۔ میں نے ان کو خوش آمدید کہا اور خیریت دریافت کی۔ انہوں نے رات دیگر قیدیوں کے ساتھ گزاری تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس ریڈ کراس کے لوگ آئے تھے مگر امریکی نہیں چاہتے کہ ریڈ کراس والے ہم سے ملیں۔ ہم نے عصر تک خوب گپ شپ کی۔ ان دو دنوں کے دوران نسبتاً اچھا کھانا دیا گیا۔ دوسری شام ان کو پھر لے جایا گیا۔ میرے کمرے میں بلا کی سردی تھی۔ دو دن بعد مجھے نچلی منزل لے جایا گیا جہاں محمد قاسم حلیمی اور سالم موجود تھے۔ یہاں ہم نے پھر گپ شپ شروع کی۔ ہم تین دن ساتھ رہے۔ آخری رات ان کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ رات کو حلیمی صاحب کو بھی تفتیش کے لیے لے جایا گیا۔ میں عشاء کی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا کہ فوجی آئے اور کہا آپ کو نیچے لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے نیچے دوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی دیکھا جن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ یہ بیس کے لگ بھگ افراد تھے جن کے چہروں پر کالے سیاہ تھیلے چڑھائے گئے تھے جو منتقل ہونے کی نشانی تھی۔ ہمیں پتا نہ تھا کہ کہاں منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہم سب کے ہاتھ پیچھے باندھے گئے اور قطار میں کھڑا کر کے سب کو ایک رسی سے باندھ دیا گیا۔ اس رسی کو امریکی فوجی کبھی ایک جانب کھینچتے، کبھی دوسری جانب۔ جس سے سارے قیدی ایک طرف گر جاتے، ان کو اٹھایا جاتا اور پھر یہی عمل دہرایا جاتا۔ نافع نامی ایک سوڈانی عرب کی دونوں ٹانگیں زخمی تھیں۔ وہ درد کے مارے چیختا تو فوجی اس کو چپ کرانے کے لیے مارنا شروع کر دیتے تھے۔ امین اللہ نامی ہمارا ایک ساتھی چیخ چیخ کر کہتا کہ ہمیں ذبح کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ ہم سب کا اندازہ یہی تھا کہ ہمیں مار دیا جائے گا۔ کوئی بآواز بلند کلمہ شہادت کا ورد کر رہا تھا، کسی نے قرآن مجید کی آیات کی تلاوت شروع کر دی تھی۔ اسی کشمکش میں ایک طرف روانہ کر دیا گیا۔ یہ ویران اور بنجر زمینیں تھیں۔ ہم گرتے پھر اٹھ جاتے۔ ہم نے ایک

بڑے جہاز کی آواز سنی۔ ہمیں رفتہ رفتہ اس جہاز کے قریب لے جایا گیا۔ جہاز کے نزدیک لے جا کر ہمیں دھکے دیئے گئے اور ایک دوسرے کے اوپر گرا دیا گیا پھر ایک ایک کر کے جہاز میں چڑھایا گیا جہاں گردن اور پاؤں کو رسیوں سے باندھ کر ہمیں جہاز میں ایک بنچ سے باندھ دیا گیا۔ ہم میں سے کوئی فریاد کرتا تو اسے مضبوط لات پڑتی۔ یہ غالباً ۸ یا ۹ فروری ۲۰۰۲ء کا دن تھا۔ ایک گھنٹہ بعد جہاز اترا اور تمام قیدیوں کو باری باری اتارا گیا۔ مجھے کھینچتے ہوئے جہاز سے دور لے جایا گیا اور گھونسوں، لاتوں، ٹھوکروں کی بارش کر دی گئی۔ پھر ہم سب کو اکٹھا کیا گیا کبھی ایک ایک کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا، کبھی ایک ایک فوجی کئی کئی قیدیوں کو مارتا، سخت سردی میں مٹی میں بٹھا کر اوپر پانی ڈالا جاتا اور وحشی فوجی دانوں سے کاٹنے لگتے۔ اس سلوک سے بھی وہ مطمئن نہ ہوتے تو لاٹھیوں سے حملہ آور ہو جاتے۔ ہمارے لیے قدرے اطمینان کی بات یہ تھی کہ چونکہ چہرے پر تھیلے چڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے ہمارے چہرے مٹی سے بچے ہوئے تھے۔ اس دوران دو فوجیوں نے بازوؤں سے پکڑ کر مجھے مٹی سے باہر نکالا اور اپنے بھاری بوٹوں سے میری پسلیوں میں ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ مجھے اٹھا کر زمین پر الٹا پٹخ دیا جاتا۔ زمین پر پڑتے ساتھ ہی پانچ فوجی میرے سر، کمر اور ٹانگوں پر چھلانگیں لگانا شروع کر دیتے۔ اس ظلم کے دوران میں سوچتا کہ کہاں گئے وہ انسانی حقوق کے علمبردار؟ میرا ننگا بدن اور اتنا ظلم، مگر میں اللہ سے حوصلہ مانگتا تھا پھر کیمروں کی ٹک ٹک شروع ہو گئی۔ قیدیوں کی تصاویر بنانے کا عمل شروع ہوا۔ فلیش کی لائٹس سے آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اس بدترین تشدد کے دوران میرے سر کا تھیلا اترا ہوا تھا۔ میں نے زندگی کا ہولناک منظر دیکھا جب ساری قیدی ننگے تھے، کوئی مٹی میں پڑا تھا، کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ میرا دل پھٹا جاتا تھا۔ امریکی مرد و عورتوں کے لیے یہ دل لبھانے والا تماشا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر ہم بے بس انسانوں کی تصویریں بنا رہے تھے اس انسانیت سوز مظاہرے کے بعد ہمیں ایک بڑے خیمے کے اندر لے جایا گیا، جہاں سوال جواب، فوٹو گرافی اور ڈاکٹر کے ذریعے طبی معائنے کے بعد ہمیں یونیفارم دیا گیا۔ خیمے کی چار دیواری لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی تھی جو زمین سے صرف ایک میٹر اونچی تھی۔ خیمہ مستطیل شکل کا تھا اور چاروں طرف خاردار تاریں بھی لگائی گئی تھیں۔ اس قسم کے خیمے چاروں اطراف میں نظر آتے تھے۔ ایک ایک خیمے میں بیس

کمانڈر دوستم کے ہولناک مظالم

تاجکستان کے محمد یوسف اور یمن کے مختار میرے پڑوس میں قید تھے۔ ان کو قلعہ جنگی سے زندہ گرفتار کیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنا بپتا سنائی کہ وہ کس طرح گرفتار ہوئے اور دوستم کے وحشی فوجیوں کے مظالم کا شکار بنے۔ وہ کہتے کہ دوستم اور ان کے ساتھی، طالبان مجاہدین کو گولی نہ مارتے بلکہ کھلے میدان میں کھڑا کر کے ننگا کر دیتے، کانوں میں لکڑی کے ٹکڑے ٹھونس دیتے اور پتھر مار مار کر مار دیتے تھے۔ طالبان کو ننگا کر کے میدان میں پھرایا جاتا۔ پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر کنٹینر میں بند کر دیا جاتا اور تالا لگا کر کنٹینر کے نیچے آگ جلا دی جاتی۔ اس طریقے سے دوستم نے پانچ سے آٹھ ہزار تک طالبان کو جان سے مارا۔ محمد یوسف نے بتایا کہ میرے ناخن پلاس کے ذریعے نوچے گئے۔ وہ باقاعدہ پاسپورٹ لے کر افغانستان گیا تھا اور قندوز میں مزدوری کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا کہ ایک کنٹینر میں ۳۳۰ طالبان کو ٹھونس ٹھونس کر بند کیا جاتا، کنٹینر کے باہر جو آوازیں سنائی دیتیں تو لگتا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے کوئی کہتا کہ حضور (ﷺ)! آ رہے ہیں، کوئی کہتا ہم جنت جا رہے ہیں۔ یوسف نے کہا کہ مجھے بھی تین دن تک کنٹینر میں بند رکھا گیا۔ تین دن بعد جب کنٹینر کھولا گیا تو اس میں صرف چند افراد ہی زندہ بچے تھے جن میں سے ایک میں بھی تھا۔

افراد سما سکتے تھے۔ مجھے ایک فوجی نے وہ سامان دکھایا جو غالباً ہر قیدی کو دیا گیا تھا۔ ایک اوڑھنے کی چادر، ایک جوڑا جراب، بوٹ اور کپڑے کی ایک ٹوپی مجھے بھی دے دی گئی۔ مجھے نارنجی شلوار قمیص بھی دی گئی جو میں نے پہن لی۔ ملا محمد صادق بھی اسی خیمے میں لائے گئے جن کا تعلق صوبہ ارزگان سے تھا۔ ان کو چمن سے گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ وہ افغان جہاد کے دنوں میں صدقیہ تنظیم کے پلیٹ فارم سے ہمارے امیر رہے تھے۔ سخت سردی تھی۔ میں نے ان کو لباس پہننے میں مدد دی۔ آس پاس کے خیموں میں قیدی ایسے لگتے تھے جیسے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے ہوں۔ ملا اخوند مجھ سے بار بار پوچھتے کہ کتنے لاشے پڑے ہوئے ہیں؟ میں کہتا کہ یہ مرے نہیں' سو رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہر خیمے سے اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے ہم کسی شہر میں ہوں۔ ملا اخوند نے الحمدللہ کہا، سجدے میں گر گئے اور کہا: ضعیف بھائی! مجھے تو لگتا ہے کہ ہم اسلام کے قلعے میں آ گئے ہیں۔''

اذانوں کی آوزیں اتنی مسحور کن تھیں کہ سردی، درد، بھوک اور پیاس سمیت ساری تکلیفیں بھول گئے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ مار پیٹ، بدن کا ننگا ہونا، ہفتہ ہفتہ بھر بھوکا پیاسا رہنا نجانے خدا کیوں ناراض ہے اور ہم نے مزید کن امتحانوں سے گزرنا ہے۔

قندھار میں تفتیش کا مرحلہ:

صبح ہوئی، ہم نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد آرام کرنا چاہا مگر اجازت نہ دی گئی۔ مجھے چھوڑ کر عرب بھائیوں کو تفتیش کے لیے لے جایا گیا۔ لے جاتے وقت بہت مشکل لمحہ ہوتا، فوجی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لے کر آتے اور چیخ چیخ کر کہتے کہ نکلو، پھر ہاتھ پیچھے باندھ کر بندوقیں تان لیتے اور دوزانو کھڑا کر کے پھرنے پر مجبور کرتے۔ قیدیوں کو مٹی کے گارے میں پھینکتے پھر اٹھاتے۔ اس کے بعد سر اور چہرے پر تھیلا چڑھا کر باہر نکالتے اور خیمے کا دروازہ بند کر دیتے۔ آرام ہمیں نہ دن کو تھا، نہ رات کو۔ تفتیش کے مراحل دونوں اوقات میں ہوتے تھے۔ تفتیش کے لیے لے جاتے وقت قیدیوں کے سر زمین سے رگڑے جاتے۔ ان کو گھٹنوں کے بل چلنے کو کہا جاتا۔ پیچھے کتے لگا دیئے جاتے تا کہ قیدی تیز تیز چلیں۔ اس دوران ایک بے حیا، نیم برہنہ امریکی عورت اپنی تیز اور کانوں میں سیسہ گھولتی آواز سے تیز چلنے کو کہتی۔ میں جب گھٹنوں کے بل جاتا تو میرے گھٹنوں کا گوشت ادھڑ جاتا اور شلوار پھٹ جاتی تھی۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا جاتا۔ اس دوران آنکھیں بندھی ہوتیں۔ میں اور میرے دوسرے ساتھی بے رحم امریکی فوجیوں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ اگلی صبح ریڈ کراس کے کچھ لوگ آئے جو ہماری حالت زار سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں کاغذ دیئے کہ اپنے گھروں کو خط لکھیں۔ ریڈ کراس کے اہلکار خاردار تار کے اس پار کھڑے ہو کر ہماری طبیعت پوچھتے۔ ہمارا شک تھا کہ یہ کسی امریکی خفیہ ادارے کے لوگ ہوں گے۔ اس لیے ہم احتیاط سے بات کیا کرتے اور ان کو دل کا حال نہ بتا سکتے تھے۔ ریڈ کراس کا خطوط کے تبادلے میں جو کردار تھا' وہ قابل ستائش ہے۔ ریڈ کراس والے روٹی، چائے اور کتابوں کی دستیابی کے حوالے سے پوچھتے۔ ہم کہتے کہ مناسب مقدار اور تعداد میں یہ چیزیں نہیں مل رہیں۔ احترام انسانیت، مذہبی کتابوں کے تقدس کا خیال رکھنے اور مناسب مقدار میں پانی دینے کے ہمارے مطالبات کبھی بھی پورے نہیں ہوئے۔

۱۰ر فروری ۲۰۰۲ء سے جولائی کے آغاز تک مجھے قندھار میں رکھا گیا۔ اس دوران چہرہ دھویا سکا نہ ہاتھ۔ صرف پینے کے لیے تھوڑا سا پانی ملتا تھا۔ چوری چھپے منہ ہاتھ دھونے پر سخت سزا دی جاتی اور اسی خوف سے کوئی ہاتھ پیر اور منہ دھونے کی کوشش نہ کرتا۔ ایک مرتبہ سات سات افراد کو باندھ کر خیمے سے چند قدم دور لے جایا گیا جہاں باری باری سب کے کپڑے

اتارے گئے۔ ہر قیدی اپنے مخصوص اعضاء تک چھپانے سے قاصر تھا۔ سب کو ایک ایک لوٹا پانی دے کر خود کو دھونے کا حکم سنایا گیا۔ امریکی مرد و عورتیں ارد گرد کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے۔ یہ بہت توہین آمیز بات تھی کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے خود کو دھوئیں۔ میں ساتھیوں کو آواز دیتا کہ ہم مجبور ہیں، آنکھیں بند کر کے نہائیں۔ یہ میرے لیے انتہائی افسوسناک بات تھی کہ قندھار کی سرزمین پر ہمیں منہ ہاتھ دھونے کی اجازت دی گئی اور نہ غسل کرنے کی۔

اگلے دن مجھے تفتیش کے لیے لے جایا گیا۔ قندھار میں مجھ سے تفتیش کا یہ دوسرا مرحلہ تھا۔ ایک ٹینٹ میں لے جا کر ہاتھ باندھے گئے اور بائیوگرافی لکھی گئی۔ اس کے بعد نسبتاً نرم لہجے میں سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ سوال پوچھنے والوں کی ملا عمر اور اسامہ بن لادن سے دلچسپی زیادہ تھی۔ میرے جوابات اکثر نفی میں ہوتے۔ تین مختلف قسم کے کاغذات، سرخ، زرد اور سفید پر لکھے جاتے۔ دو گھنٹے پر محیط اس تفتیش کے بعد تھیلا سر اور چہرے پر چڑھا کر مجھے واپس لایا گیا۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ مجھے لے جایا جاتا اور واپس لایا جاتا۔ سوالات بھی روزانہ ایک ہی قسم کے ہوتے اور میرے جوابات بھی۔ قندھار میں دورانِ قید شرائط زیادہ سخت نہ تھیں۔ ہر خیمہ میں بیس قیدیوں کو رکھا جاتا جن میں تین افراد کو اکٹھا بیٹھنے کی اجازت تھی۔ تین سے زیادہ بیٹھتے اور باتیں کرتے تو سخت سزا دی جاتی تھی۔ ہم نماز باجماعت پڑھ سکتے تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ دھوپ میں بھی بیٹھنے کی اجازت تھی مگر جس چیز کا نام انسانی عفت ہے' وہ یہاں عنقا تھی۔

رات کو سونے کے دوران کتوں کے بھونکنے سے سارے قیدی جاگ جاتے۔ اس وقت تک قیدیوں کی تعداد چھے سات سو تک پہنچ چکی تھی۔ فوجی اپنے کتوں کے ہمراہ آتے، ایک ایک قیدی کو الٹا لٹا کر اس کی تلاشی لیتے، کتے قیدیوں کے بدن سونگھتے۔ یہ سلسلہ ساری رات چلتا رہتا۔ قیدیوں کو زائد المیعاد ڈبہ بند خوراک دی جاتی تھی جس میں کبھی کبھار خنزیر کا گوشت بھی ہوتا تھا جو بہت سے بھائی لاعلمی میں کھا لیا کرتے تھے۔ وہ ڈبوں کا لکھا نہیں جانتے تھے بالخصوص انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے۔ اکثر اوقات خوراک سے بدبو آتی مگر یہ جاننے کے باوجود کہ یہ خوراک صرف صحت کے لیے نقصان دہ ہے، ہم مجبوری کے تحت کھا لیتے تھے کیونکہ ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ جون میں ہماری خوراک میں تبدیلی لائی گئی۔ اب کی بار خوراک کی کیفیت بھی اچھی تھی اور ساتھ کچھ میوہ اور میٹھا بھی دیا جانے لگا۔ خوراک کے ڈبوں پر ''حلال'' اور "Kosher" لکھا ہوتا۔ خوراک کے ساتھ ایک افغانی روٹی بھی دی جانے لگی۔ روٹی کی تقسیم کا طریقہ کار یہ تھا کہ خیمے کے سامنے ڈبوں کا کارٹن رکھا جاتا۔ ایک ایک بوتل پانی بھی دیا جاتا۔ آدھے گھنٹے میں کھانا کھا کر ڈبے واپس کرنے کی پابندی تھی۔ کوئی یہ پابندی توڑتا تو اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ تیونس کے عادل اور الجزائر کے سمیر بڑے ''اداکار'' تھے۔ کسی طریقے سے دو دو ڈبے ہتھیا کر چھپ چھپ کر کھاتے۔ بیس افراد کے لیے ٹائلٹ پیپر کا ایک رول روزانہ دیا جاتا۔ ایک باریک کپڑے کی چادر لگا کر بیت الخلاء بنا گیا تھا۔ رفع حاجت کے وقت ہم فوجیوں کو اور فوجی ہمیں نظر آتے۔ دن میں تین مرتبہ طبی عملہ آتا جس میں اکثریت عورتوں کی تھی اور وہ مکمل ڈاکٹر معلوم نہ ہوتے تھے۔ ہر مرض کی دوا پانی کو قرار دیتے تھے۔ قبض، بخار اور زکام عام بیماریاں تھیں۔ قیدیوں کے خیمے ائرپورٹ کے نزدیک ایسی جگہ لگائے گئے تھے جہاں ہر وقت طیاروں کا شور ہوتا اور گرد و غبار کے مرغولے اٹھتے۔ کپڑے اور خوراک ہر وقت مٹی سے اٹی رہتی تھی۔ طیاروں کے گزرنے کی وجہ سے خیمے اوپر اٹھ

جاتے۔قیدی اس وجہ سے رات کو نیند پوری نہ لے سکتے تھے۔امریکی فوجی قیدیوں کو تشدد کا نشانہ بناتے وقت ایسی غلیظ گالیاں دیتے جو انگریزی نہ جاننے کے باوجود سب کو سمجھ آتی تھیں۔فوجی جس قیدی کو سویا ہوا پاتے تو اس کے سر پر چھوٹی کنکری یا ڈھیلا مارتے اور اس کی نیند خراب کر دیتے تھے۔دن رات میں تین دفعہ قیدیوں کی گنتی کی جاتی اور سب کو قطار میں کھڑا کر کے باقاعدہ ''حاضری'' لی جاتی تھی۔میرا نمبر 306 تھا۔یہاں مجھے دو بہت دلچسپ قصے یاد آ گئے۔

گنتی کرنے والوں کی اپنی شرائط تھیں۔ہر بار نیا فوجی گنتی کرنے آتا۔ایک مرتبہ ایک فوجی آیا اور ترجمان کی مدد سے حکم سنایا کہ جب میں نظر آؤں تو تمام قیدی کھڑے ہو جائیں اور قطار بنا کر سر جھکائیں۔جس قیدی کا نمبر پکاروں' وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ جائے۔حیرانی اس بات پر نہ تھی کہ ایک کم درجے کا فوجی یوں غرور کا مظاہرہ کر رکھا تھا بلکہ افسوس اس بات کا تھا کہ اس امریکی کو جیسے ملک میں کوئی دوسرا دھندہ ہاتھ نہ آیا تو جو میں بھرتی ہو گیا اور یہاں آ کر مسلمانوں سے اپنی نفرت کا یوں متکبرانہ انداز میں اظہار کر رہا تھا۔ایک کالا کلوٹا بندر کی شکل کا فوجی جو انتہائی سخت گیر تھا،گنتی سے پہلے تمام قیدیوں کو کھڑا کرتا اور گنتی کا عمل دو دو تین تین گھنٹے تک جاری رکھتا۔یہ یہاں زندگی گزارنے کے لیے آیا تھا۔شیر سے لے کر ٹڈی دل تک کے حقوق کا اس ملک پر چارک تھا مگر ہم مسلمانوں کے لیے جائے پناہ نہیں تھی۔ایک دن ہمارے خیمے کے خاردار تار چیک کر رہا تھا کہ اس کو زمین پر شیشے کا ایک ٹکڑا ملا۔میرے پاس آ کر پوچھا: یہ شیشے کا ٹکڑا کون لایا ہے؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ نہ سامان میرا اپنا ہے اور نہ خود آیا ہوں۔اس نے اصرار کیا کہ مجھے بتاؤ مگر چونکہ واقعی مجھے علم نہیں تھا' اس لیے میرے جواب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔وہ چیخ چیخ کر غلیظ گالیاں بکنے لگا۔اس نے مجھے دوزانو کھڑا کیا اور صلیب کی طرح ہاتھ پھیلانے کا حکم سنایا۔اسی طرح کئی گھنٹے گزر گئے۔وہ مجھے دیکھتا تو گالیاں سناتا۔میں پوچھتا کہ گالیاں کیوں دیتے ہو؟ تو مزید گالیاں دینا شروع کر دیتا۔فوجیوں کو جواب دینا جرم تھا۔ان کے لیے کوئی قانون نہ تھا۔غلاموں کی یہ بادشاہی یاد آتی ہے تو دل بہت جلتا ہے۔ہم دلیر جوان، جو اِن بزدل لوگوں کے چنگل میں تھے، کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ہمارے پڑوس میں ایک دوسرا قید خانہ تھا' جہاں کے قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا۔ان کے جسم کپڑوں سے بے نیاز تھے اور ان پر کتے بھی چھوڑے جاتے تھے۔ایک دن ہمارے قید خانے میں ایک سفید ریشے بوڑھے کو لایا گیا جو اپنے حواس کھو چکا تھا،انتہائی سہما ہوا تھا،فوجیوں اور قیدیوں میں تمیز نہ کر سکتا تھا،کمزوری کی وجہ سے نہ اٹھ سکتا تھا،نہ بول سکتا تھا۔فوجیوں نے اس پر چڑھ کر اس کو باندھنا شروع کیا تو وہ زور زور سے چیخنے لگا کہ دو رکعت نفل تو پڑھنے دو پھر ذبح کر لو۔ہم نے سمجھایا کہ بابا آپ کو ذبح کرنے نہیں' تفتیش کرنے لے جایا جا رہا ہے مگر وہ ہماری نہ سنتا تھا۔یہ پہلا قیدی تھا جس کو بعد میں گوانتاناموبے سے رہا کیا گیا۔اس کی عمر ۱۰۵ سال تھی اور تعلق صوبہ ارزگان سے تھا۔

ایک رات کھانا کھایا،نماز سے فارغ ہونے کے بعد سونے ہی لگے تھے کہ اچانک بہت ساری تعداد میں فوجی اندر آئے۔باہر ہیلی کاپٹر کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔فوجیوں نے آتے ساتھ ہی ہلہ گلہ مچا دیا۔ایک ایک قیدی کو باہر پھینکتے اور الٹا لٹا کر تلاشی لیتے۔اس منظر کی ویڈیو فلم بھی بنائی گئی تا کہ وہ امریکیوں کو دکھا سکیں کہ ہم نے دہشت گردوں (ان کے بقول) کو کس طرح قابو میں رکھا ہوا ہے۔ایک مرتبہ آدھی رات کو لگ بھگ ایک بجے کے قریب دو فوجیوں کے ذریعے مجھے بندھی آنکھوں اور بندھے ہاتھوں تفتیش والے کمرے لے جایا گیا جہاں میری خوب خاطر مدارت کی گئی، مجھے کرسی پر بٹھایا گیا، سامنے میز پر چائے اور کچھ مٹھائی پڑی تھی، بعد میں دو اور فوجی بھی آ گئے جن کا رویہ غیر متوقع طور پر شائستہ تھا۔میں حیران تھا

کہ آج یہ کیسے انسان کے بچے بن گئے ہیں۔انہوں نے میرا ہاتھ کھولا اور پھر انتہائی نرم لہجے میں میری طبیعت پوچھی۔گھر کے بارے میں پوچھا اور بتایا کہ ہمیں آپ کے خلاف کوئی شہادت نہیں ملی۔انہوں نے پیسے کی لالچ دی اور اس شرط پر رہائی کی پیشکش کی کہ آپ ملاعمر اور اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔معلوم نہیں اس وقت مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی کہ میں نے انتہائی پراعتماد لہجے میں کہا کہ مشروط رہائی سے میری گرفتاری بہتر ہے۔میں نے اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھی تو ایک فوجی نے بتایا کہ ہمیں شک تھا کہ آپ القاعدہ اور نائن الیون کے واقعے کے بارے میں جانتے ہوں گے مگر ہمیں اس حوالے سے آپ کے ذریعے کوئی معلومات نہیں ملیں (ان کی نظر میں' میں ماڈریٹ تھا)۔میں نے ان سے کہا کہ آپ کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔میں نے ان کی شرائط پر رہا ہونے سے صاف انکار کیا تو ان کا رویہ سخت ہو گیا اور نامراد واپس لوٹنا پڑا۔وہ لگاتار تین دن تک آتے رہے اور مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کا کہتے رہے مگر میرا جواب ایک ہی تھا۔

ایک دن مجھے تفتیش کے لیے لے جایا گیا تو ایک تفتیش کار نے پوچھا کہ آپ متوکل صاحب (طالبان دور کے وزیرخارجہ) کو جانتے ہیں؟ان کا احترام کرتے ہیں؟اور کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان سے آپ کی ملاقات ہو؟میں نے اثبات میں جواب دیا۔مجھے شک ہوا کہ وکیل احمد متوکل صاحب بھی پکڑے گئے ہیں۔میں نے پوچھا: متوکل صاحب کہاں ہیں اور ان سے کیسے ملاقات ہو سکتی ہے؟تفتیش کار نے بتایا کہ وہ ہماری تحویل میں ہیں،آپ چاہیں تو لے آئیں؟میں نے کہا ضرور۔میں ان سے اس لیے بھی ملنا چاہتا تھا کہ معلومات لے سکوں اور ان سے طالبان بھائیوں کی حالت زار بارے پوچھ سکوں مگر مجھے اس امر کا پتا نہیں تھا کہ ہماری ملاقات سے امریکی فوج کا مقصد کیا تھا؟ کچھ دیر بعد متوکل صاحب کو لایا گیا۔ان کے ہاتھ میں ایرانی بسکٹ بھی تھے جو وہ بطور تحفہ میرے لیے لائے تھے۔علیک سلیک کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔اس لیے بسکٹ کھانا ممکن نہ تھا۔میں ان کا تحفہ قبول کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا مگر یہ بسکٹ میں اپنے ساتھ بھی نہ لے جا سکتا تھا۔

دس منٹ گفتگو کے بعد متوکل صاحب رخصت ہوئے اور مجھ واپس لے جایا گیا۔اس ملاقات سے مجھے اندازہ ہوا کہ بہت جلد گوانتاناموبے لے جایا جاؤں گا۔گو کہ متوکل صاحب نے ایسی کوئی واضح بات نہیں کہی تھی مگر میرا گمان یہی تھا۔اس کے دوسرے دن مجھے پھر تفتیش والے کمرے لے جایا گیا۔یہ قندھار میں میری تفتیش کا آخری مرحلہ تھا۔تفتیش کار نے مجھے بتایا کہ یکم جولائی کو گوانتاناموبے کے لیے آپ کی پرواز ہوگی۔ہم ان قیدیوں کو گوانتاناموبے بھیجتے ہیں جو مرتے دم تک وہاں رہیں گے اور موت کے بعد بھی یہ گارنٹی نہیں کہ ان کی میت وطن واپس لائی جائے گی یا نہیں؟اب یہ آپ کے پاس آخری موقع ہے بتائیں گھر جانا ہے یا گوانتاناموبے؟ گھر واپسی کے لیے اس تفتیش کار نے اپنی پرانی شرائط دہرائیں۔بالفاظ دیگر مجھے کہا کہ آپ کو رہائی کے بدلے امریکی جاسوس بننا ہوگا۔اللہ مجھے اس کام سے بچائے۔تفیش کار نے سوچنے کے لیے پھر ایک دن کی مہلت دی اور کہا کہ خوب سوچ سمجھ کر کل جواب دے دو۔میں نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا کہ کل بلانے کی ضرورت نہیں۔میں نے سوچ لیا ہے کہ میں کسی قسم کی مصلحت سے کام نہیں لوں گا کیونکہ میں خود کو قصوروار نہیں سمجھتا۔آپ کی مرضی جہاں لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔میرا جواب سننے کے بعد مجھے واپس خیمے لایا گیا۔میں اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کب مجھے گوانتاناموبے روانہ کیا جائے گا۔اس کے اگلے دن میری داڑھی،سر کے بال اور مونچھیں پھر مونڈ دی گئیں۔

جاری ہے

داڑھی.....!

ایک اخباری اطلاع کے مطابق لاہور ائر پورٹ پر داڑھی والے افراد کی تعیناتی سے گریز کرنے کی ہدایات جاری کر دی گئی ہیں۔

لگتا ہے کہ داڑھی پر وائٹ ہاؤس کی ''جھاڑی'' کا سایہ بد پڑ گیا ہے وگرنہ پابندی لگانے والے خود بھی تو داڑھیوں کے سائے میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔

یوں تو داڑھی ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ رکھتے ہیں لیکن مردِ مسلم کی داڑھی دکانِ مغرب اور ان کے عشاق کو کچھ زیادہ ہی چبھنے لگی ہے۔ یہ ایک ائیر پورٹ ہی کا معاملہ نہیں' باریش حضرات جہاں بھی ہوں گے' ہولے ہولے، دھیرے دھیرے، پیچھے پیچھے بیک ڈور سے خارج ہوتے جائیں گے اور جن کے چہروں پر روشن خیالی کا غازہ ہوگا' وہ آگے آگے نائن الیون کے ڈرامہ بازوں کو دکھائے جائیں گے۔ شناخت فروشی کا یہ بازار اب اور گرم ہوگا کیونکہ ہم شعلوں کے آگے قطار باندھے کھڑے ہیں۔

سنتِ رسول ﷺ کی توہین کیا توہین رسالت نہیں' مگر کیا کیجیے یہ توہین پوپ نے نہیں ہم نے کی ہے۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی ''کمینوں'' سے ملاقات ہو گئی

داڑھیاں تو افواجِ پاکستان میں بکثرت ہیں اور داڑھیاں تو عوام پاکستان میں بھی جگہ جگہ جلوہ گر ہیں۔ اسلام کے آثار ٹیکسلا اور موہنجودڑو کے آثار تو نہیں کہ وقت کے ساتھ مٹ جائیں گے۔ مولانا ظفر علی خان کے اس منظوم فارمولے پر بھی غور کر لینا چاہیے.....

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

(''سرراہے''۔ نوائے وقت۔ ۶/اکتوبر ۲۰۰۶ء)

قارئین متوجہ ہوں

قارئین کی طرف سے یہ شکایت موصول ہوتی ہے کہ ہمیں سالانہ چندہ ختم ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ملی اور رسالہ بند کر دیا گیا ہے۔ اس لیے رسالے کے لفافے پر پتا کے اوپر مدت خریداری درج کر دی گئی ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ درج شدہ مدت کے مطابق اپنا سالانہ چندہ ارسال کر کے اگلے سال کی تجدید کرا لیں۔ شکریہ! (سرکولیشن منیجر)

ادارہ **مجلس احرار اسلام پاکستان کی سرگرمیاں**

اخبارُالاحرار

جنرل مشرف کے الزامات قوم کے دلوں سے ڈاکٹر عبدالقدیر کی عزت وتوقیر کم نہیں کر سکتے

سید عطاء المہیمن بخاری

چیچہ وطنی (۲۷ ستمبر) مجلس احرار اسلام پاکستان کے امیر سید عطاء المہیمن بخاری نے کہا ہے کہ صدر مشرف اسلام اور مسلم کش پالیسیوں کے عوض امریکی صدر بش سے ''تھپکی'' لینے امریکہ گئے تھے۔اُن کے دعوؤں کی جلد قلعی کھل جائے گی۔ان کی کتاب کے مندرجات کو بادی النظر سے دیکھا اور پڑھا جائے تو بہت واضح ہو جاتا ہے کہ ان کو ملکی سلامتی اور دفاع سے زیادہ اپنے اقتدار کی طوالت اور امریکی مفادات عزیز ہیں۔وہ رضوان الدین احمد صدیقی کی خالہ کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے بعد مرکزی مسجد عثمانیہ میں نمازِ تراویح کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔انہوں نے کہا کہ جوں جوں بادل چھٹیں گے تو لوگوں پر حقیقت واضح ہو جائے گی۔انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ملک وملت کے محسن اور قوم کے ہیرو ہیں۔جنرل مشرف کے الزامات قوم کے دلوں سے ڈاکٹر عبدالقدیر کی عزت وتوقیر کم نہیں کر سکتے۔انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں منفی پراپیگنڈہ کر کے جنرل مشرف نے احسان فراموشی کا نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

قادیانی تنظیم ''ہیومینٹی فرسٹ'' فلاحی کام کی آڑ میں مرزائیت پھیلا رہی ہے: عبداللطیف خالد چیمہ

چیچہ وطنی (۲۷ ستمبر) مجلس احرار اسلام پاکستان کے سیکرٹری اطلاعات عبداللطیف خالد چیمہ نے اسلام آباد میں قادیانی تنظیم ''ہیومینٹی فرسٹ'' کی ارتدادی سرگرمیوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ رفاہی وفلاحی کام کی آڑ میں مرزائیت پھیلانے والی اس تنظیم نے جی ایٹ ٹو میں اپنا دفتر قائم کر رکھا ہے جہاں سادہ لوح مسلمانوں کو ورغلایا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو مرتد بنانے کے ایجنڈے پر سرعام کام ہو رہا ہے۔

ہفت روزہ ''غزوہ'' کی ایک رپورٹ کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ قادیانی سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کا بھتیجا ریحان ولی پاکستان میں مذکورہ تنظیم کا انچارج ہے اور ہیومنٹی فرسٹ کی ارتدادی سرگرمیوں کا اصل ہدف افریقی ممالک ہیں جہاں تعلیم،میڈیکل اور امداد کے نام پر لوگوں کو قادیانیت کے چنگل میں پھنسایا جا رہا ہے۔خالد چیمہ نے الزام عائد کیا کہ قادیانیت کی تبلیغ پر پابندی کے باوجود قادیانی کتب ورسائل فروخت ہو رہے ہیں اور لوگوں کے عقیدے کو خراب کرنے کے لیے قادیانیوں کو سرکاری آشیر باد حاصل ہے۔

جنرل پرویز مشرف کی کتاب نے پوری دنیا میں پاکستان کے خلاف مقدمہ درج کروادیا ہے

امریکی تابعداری میں موجودہ حکومت تمام حدود کراس کر چکی ہے

قائدِ احرار سید عطاء المہیمن بخاری اور عبداللطیف خالد چیمہ کا جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں خطاب

چیچہ وطنی (۶؍اکتوبر) مجلس احرار اسلام پاکستان کے امیر سید عطاء المہیمن بخاری نے کہا ہے کہ قرآن کو بطور دستورِ حیات نافذ کیے بغیر قیامِ ملک کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ پاکستانی حکمران، رولنگ کلاس اور جاگیردار اٹھاون برس سے عوام کا استحصال کر رہے ہیں اور بعض عناصر اپنے سیاسی مفادات کے لیے استحصالی قوتوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ ایسے میں حق سچ کی سیاست کا نعرہ لگانے والوں کا اوّلین فرض ہے کہ وہ عوام کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی و بحالی کا فریضہ انجام دیں کہ اس کے بغیر اصلاح احوال کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ گزشتہ ماہ جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں ایک بڑے دینی اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کے مرکزی رہنما عبداللطیف خالد چیمہ نے بھی خطاب کیا۔

سید عطاء المہیمن بخاری نے کہا کہ ہماری تمام تر مشکلات کا حل قرآنی وآسمانی تعلیمات میں مضمر ہے اور اسلامی تعلیمات پوری انسانیت کے مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جنرل پرویز مشرف کی کتاب نے پوری دنیا میں پاکستان کے خلاف مقدمہ درج کروادیا ہے اور امریکی تابعداری میں موجودہ حکومت تمام حدود کراس کر چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے حوالے سے جنرل پرویز مشرف کی متنازعہ کتاب کے مندرجات سے پوری قوم مختلف رائے رکھتی ہے۔ صرف سرکاری و درباری شخصیات و حلقے ان کے سرکاری گواہ اور سرکاری حامی ہیں لیکن سب کو یاد رکھنا چاہیے کہ جونہی موجودہ حکومت کے اقتدار کی چولیں ڈھیلی ہوئیں سب کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

عبداللطیف خالد چیمہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک وملت کے خلاف قادیانی سازشیں حکومتی آشیرباد کے ساتھ عروج پر ہیں۔ ختم نبوت اور ردّ قادیانیت پوری امت مسلمہ کے ایمان کا حصہ ہے۔ قادیانیوں سے امت مسلمہ کے عقیدے کو بچانا ہمارا فرض بھی ہے اور ڈیوٹی بھی۔ انہوں نے کہا کہ چناب نگر میں ۷؍ستمبر کو ہونے والی ختم نبوت کانفرنس کے سلسلہ میں قاری شبیر احمد عثمانی پر دہشت گردی کا مقدمہ درج کرنے پر شدید احتجاج کرتے ہوئے اسے چناب نگر اور ضلع جھنگ کی انتظامیہ و پولیس کی بدترین قادیانیت نوازی قرار دیتے ہوئے مقدمے کے اخراج کا مطالبہ کیا اور کہا کہ سرکاری انتظامیہ امتناعِ قادیانیت قوانین پر عمل درآمد کی صورتحال کو بہتر بنانے میں دانستہ غفلت برت رہی ہے اور چناب نگر میں مسلمانوں کو پریشان کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس صورت حال کا سنجیدگی سے نوٹس نہ لیا گیا تو ہولناک کشیدگی جنم لے گی۔

بعد ازاں قائدِ احرار سید عطاء المہیمن بخاری کے اعزاز میں جامعہ اشرفیہ عیدگاہ ساہیوال میں مولانا عبدالستار نے افطار ڈنر دیا جس میں قاری منظور احمد طاہر، قاری عبدالغنی، قاری طاہر رشیدی، حافظ محمد بلال، میاں محمد یونس، مولانا عبدالباسط، چودھری سردار محمد، صوفی عبدالشکور احرار اور متعدد دیگر حضرات نے شرکت کی۔ سید عطاء المہیمن بخاری نے اس

موقع پر علماء کرام اور دینی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ عالمی صورتحال کا حقیقی ادراک کر کے ہمیں نئی نسل کی تربیت کے فقدان کو دور کرنا چاہیے اور علماء کرام کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے۔

شُبّانِ احرار ضلع ساہیوال کا اجلاس:

چیچہ وطنی (۹ر اکتوبر) شُبّانِ احرار ضلع ساہیوال کے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ عیدالفطر کے بعد عصری تعلیمی اداروں میں تنظیم کو فعال بنایا جائے گا اور تمام سکولوں، کالجوں اور دینی مدارس میں شُبّانِ احرار کے باضابطہ یونٹ قائم کیے جائیں گے۔ یہ فیصلہ شُبّانِ احرار ضلع ساہیوال کے ایک مشاورتی اجلاس میں کیا گیا جو محمد معاویہ راشد کی زیرصدارت دارالعلوم ختم نبوت چیچہ وطنی میں منعقد ہوا اور اس میں حافظ سیف الرحمٰن، حافظ محمد مغیرہ، حافظ محمد علی، حافظ محمد عمر فاروق، حافظ عمیر توقیر، حافظ شاہد نوید، حافظ بلال جاوید، حافظ محمد یٰسین شاہ اور دیگر طلباء نے شرکت کی۔

شُبّانِ احرار کے ضلعی صدر محمد معاویہ راشد نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ لارڈ میکالے کا نظامِ تعلیم خداشناسی کی بجائے محض تلاشِ رزق کا سبق دیتا ہے اور طبقاتی تقسیم کا آغاز ہمارے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم سے ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی نظامِ تعلیم کے نفاذ کے بغیر وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے جن اعلیٰ مقاصد کے لیے یہ ملک معرضِ وجود میں آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہماری تنظیم نظریاتی محاذ پر طلباء کی رہنمائی کرنے کا عزم رکھتی ہے اور ہماری منزل حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے جو دراصل ہر مسلمان کی جدوجہد کا مرکز ہونا چاہیے۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ طلباء کو لادین فتنوں سے آگاہی کے لیے ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ سال وسیع پیمانے پر لٹریچر شائع کیا جائے گا اور تعلیمی مقاصد خصوصاً عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے تربیتی کلاسز کا اہتمام کیا جائے گا۔

قاری شبیر احمد عثمانی پر دہشت گردی کا مقدمہ درج کرنے کی مذمت

چیچہ وطنی (۹ر اکتوبر) تحریک تحفظ ختم نبوت کے رہنما اور مجلس احرار اسلام پاکستان کے سیکرٹری اطلاعات عبداللطیف خالد چیمہ نے ۷ر ستمبر کو چناب نگر میں ہونے والی ختم نبوت کانفرنس کے موقع پر کانفرنس کے منتظم قاری شبیر احمد عثمانی پر دہشت گردی کا مقدمہ درج کرنے پر شدید احتجاج کرتے ہوئے مقدمے کے اخراج کا مطالبہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں ضلع ساہیوال کے ایک سو سے زائد ممتاز علماء کرام اور دینی رہنماؤں نے بھی مطالبہ کیا ہے کہ قاری شبیر احمد عثمانی پر دہشت گردی کا ناجائز مقدمہ واپس لیا جائے اور چناب نگر میں امتناعِ قادیانیت قوانین پر عمل درآمد کی صورتحال بہتر بنائی جائے۔

☆.....☆.....☆

چیچہ وطنی (۹ر اکتوبر) مجلس احرار اسلام اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں اور کارکنوں، دارالعلوم ختم نبوت اور مرکزی مسجد عثمانیہ کے اساتذہ اور طلباء کے اعزاز میں شیخ لیاقت حسین نے مرکزی مسجدِ عثمانیہ میں افطار پارٹی کا اہتمام کیا جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات اور شہریوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مولانا محمود الحسن نے اس موقع پر فضیلت رمضان وافطار پر بیان کیا۔

ہمدرد
صُدوری
Tough on Cough
کھانسی خشک ہو یا بلغمی، صُدوری اپنے نباتاتی اجزاء
کی بدولت فوری اثر دکھاتی ہے اور سینے کی جکڑن دور
کرکے کھانسی کی تکالیف سے مکمل نجات دلاتی ہے۔
FOR COUGH & COLD
Suduri®
Hamdard
Manufactured by: Hamdard Laboratories (Waqf) Pakistan
صُدوری 120 ملی لیٹر
خشک اور بلغمی کھانسی کا شربت
For Adults : One dose of Suduri is equal to two teaspoonfuls.
For Children : Doses vary according to their age from one to half teaspoonful.
تیارکنندہ: ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان
ہمدرد
ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان
شوگر فری میں بھی
Blitz DDB

جنت میں گھر بنائیے

تحریک تحفظ ختم نبوت (شعبہ تبلیغ) مجلس احرار اسلام
چیچہ وطنی کے زیر انتظام

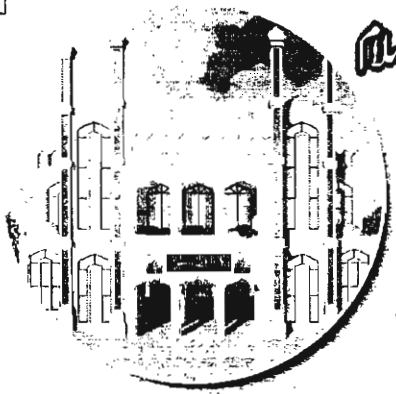

مرکزی مسجد عثمانیہ

ہاؤسنگ سکیم چیچہ وطنی کی تعمیر مسلسل جاری ہے۔تقریباً دو کنال رقبے پر مشتمل مسجد اور ملحقات تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں اور بجلی کی وائرنگ کا کام مسلسل جاری ہے۔ 45x60 کے مسجد کے ہال میں مستقبل میں ائرکنڈیشنڈ کے بڑے یونٹ لگانے کے لیے ابھی سے حسب ضرورت زمین دوز وائرنگ کا اہتمام کرلیا گیا ہے۔اب تک تقریباً ساٹھ لاکھ روپے سے زائد خرچ ہو چکا ہے جبکہ رنگ روغن، بالائی حصے کے دروازے، ہال کے لکڑی کے مین دروازے منبر ومحراب کے کام سمیت متعدد متفرق کام ابھی باقی ہیں۔جن کے لیے کم از کم بیس لاکھ روپے کا تخمینہ ہے جبکہ ائرکنڈیشنڈ کا خرچہ اس کے علاوہ ہے۔

الحمدللہ **مرکزی مسجد عثمانیہ** مجلس احرار اسلام چیچہ وطنی کا یکے بعد دیگرے تیسرا مرکز ہے۔ جو اِن شاء اللہ مستقبل میں اپنی شناخت اور نظریاتی وفکری کام خصوصاً عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے حوالے سے منفرد کردار ادا کرے گا۔مسجد عثمانیہ کی تکمیل کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ چیچہ وطنی میں چوتھے مرکز احرار **"مسجد ختم نبوت اور ختم نبوت سنٹر"** رحمان سٹی ہاؤسنگ سکیم اوکانوالہ روڈ چیچہ وطنی کی تعمیر کا آغاز کیا جائے گا۔یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے: ایں سعادت بزورِ بازو نیست

جملہ احباب ومعاونین سے درخواست ہے کہ دعا اور تعاون جاری رکھیں

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر: 9-2324 نیشنل بینک جامع مسجد بازار چیچہ وطنی
اکاؤنٹ بنام: مرکزی مسجد عثمانیہ ہاؤسنگ سکیم چیچہ وطنی

منجانب **انجمن مرکزی مسجد عثمانیہ (رجسٹرڈ) ای بلاک لوانکم ہاؤسنگ سکیم چیچہ وطنی** 0300-6939453

Monthly "Naqeeb-e-Khatm-e-Nabuwwat" Multan. Regd. M. No: 32

بیاد مجدد بنی ہاشم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

مدرسہ معمورہ

بانی
سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ

قائم شدہ
28 نومبر 1961ء

دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان

الحمدللہ

مدرسہ معمورہ اپنے تعلیمی وفکری سفر پر گامزن ہے اور تسلسل کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ طلباء کے لیے مدرسہ معمورہ اور طالبات کے لیے جامعہ بستانِ عائشہ میں حفظ وناظرہ قرآن، درسِ نظامی اور پرائمری شعبوں میں تعلیم جاری ہے۔

- دارالقرآن
- دارالحدیث
- دارالمطالعہ
- دارالاقامہ

کی تعمیر میں حصہ لیں

2004ء میں مدرسہ سے ملحق ایک مکان خریدا گیا جس میں اب دارالقرآن، دارالحدیث اور دارالمطالعہ کی تعمیر شروع کی جارہی ہے۔ احباب سے اپیل ہے کہ حسبِ سابق نقد وسامانِ تعمیر دونوں صورتوں میں تعاون فرما کر اجر حاصل کریں۔

ترسیلِ زر

بذریعہ بینک: چیک یا ڈرافٹ بنام سید محمد کفیل بخاری مدرسہ معمورہ
کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 2-3017 یو بی ایل کچہری روڈ ملتان
بذریعہ آن لائن: 2-3017-010 بینک کوڈ: 0165

الداعی الی الخیر
ابن امیر شریعت سید عطاء المہیمن بخاری
امیر مجلس احرار اسلام پاکستان

Designed by 0321-6358191